اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مارچ، اپریل ۲۰۱۹ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دوماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مارچ، اپریل ۲۰۱۹ء

شمارہ نمبر ۲۰

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

- ☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
- ☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
- ☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
- ☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
- ☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
- ☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
- ☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
- ☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
- ☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
- ☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
- ☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
- ☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سکین نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

چوکے

قسطوں قسط

سفر وسیلۂ ظفر

ہزلیات وغزلیات

ہنسپتالیات

کالم گلوچ

لمرل شمرل

نظمالوجی

مزاحیے

مشتری ہوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

سرگوشیاں

قدیم وجدید طنز ومزاح نگاروں نے نظم اور نثر میں تحریف کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں، نظم میں کامیاب ترین تحریف وہ ہوتی ہے جس میں اصل متن کم سے کم الفاظ میں تبدیلی کر کے مفہوم کو مکمل طور پر بدل دیا جائے، جیسے اس شعر میں ؎

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ　　محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

کی کامیاب پیروڈی ؎

شائد مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ　　محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

کامیاب ترین تحریف کی مثال ہے، جس میں ایک دو لفظوں کی تبدیلی سے مفہوم یکسر بدل گیا ہے۔

نظم کی نسبت نثر کی تحریف کس قدر مشکل ہوتی ہے مگر مزاح کی دنیا میں اس کی مثالیں کم نہیں مثلاً داستان غریب حمزہ، قصہ چہار درویش، قصہ گل بکاولی، الف لیلیٰ جدید، سندباد حجازی، راہنمائے میاں بیوی (بے تصویر) خواب اور تعبیر (بے تصویر) پرچہ جات، عربی مجلّاس، نفسیاتی مسائل وغیرہ۔ یہ تحریفیں بڑے بڑے مزاح نگاروں کے قلم سے نکلی ہیں جن میں شفیق الرحمٰن، سلیمن اختر اور ابن انشا جیسے چوٹی کے مزاح نگار شامل ہیں۔

اکثر ڈائجسٹوں میں اقوال زریں کی پیروڈی (اقوال مس زریں) کے نام سے پڑھنے کو ملتی تھی، جو عموماً نئے طنز ومزاح نگاروں کی کاوشیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ بھی کامیاب تحریف کی مثال ہے لیکن اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اقوال مس زرّیں کی ترکیب تو اردو قواعد کے مطابق درست ہے لیکن اقوال زرّیں کی ترکیب غلط ہے کیونکہ اقوال کے لام کے نیچے اضافت کا، کی کے معنوں دے رہی ہے جو کہ زائد ہے اور اس طرح مطلب بنتا ہے سنہری اقوال اس کو زرّیں اقوال لکھنا درست ہے۔ یہی صورت جامِ شیریں کی ہے۔ اس میں بھی اضافت زائد ہے اور اسے شیریں جام لکھنا درست ہے لیکن کیا کیجئے کہ اضافت کی یہ غلطی اِتنی عام ہو چکی ہے کہ اس کی درستگی عملاً بہت مشکل ہے، بہت سی دینی جماعتوں کے نام قواعد کی رو سے درست نہیں ہیں مثلاً تحریکِ اسلامی، تنظیمِ اسلامی۔ جماعتِ اسلامی اور دعوتِ اسلامی کے مرکبات میں یہی اضافت کی غلطی موجود ہے اور ان کی دُرست صورت یوں بنتی ہے ''تحریک اسلام'' یا ''اسلامی تحریک''، تنظیم اسلام یا اسلامی تنظیم، جماعتِ اسلام یا اسلامی جماعت، دعوتِ اسلام یا اسلامی تنظیم کیونکہ ''ی'' اور '' ِ'' اضافت دونوں کا، کی، کے مطلب دیتے ہیں اس لئے ان میں سے کوئی ایک علامت ہی استعمال ہوگی۔ اسی طرح یہ مرکبات دیکھئے مجلسِ علمی، جماعتِ قومی، مدارسِ دینی، انتشارِ ذہنی، علومِ شرقی، تہذیبِ مغربی یہ ایسے مرکبات ہیں جو بڑے بڑے ادباء اپنی تحریروں اور کتابوں میں اسی طرح لکھتے ہیں لیکن ان میں بھی وہی غلطی ہے، یعنی اضافت کی علامت زیر اور ''ی'' بیک وقت موجود ہے لہٰذا ان مرکبات کی درست صورت علی الترتیب یوں ہوگی، علمی مجلس یا مجلسِ علم، جماعتِ قوم یا قومی جماعت، مدارسِ دین یا دینی مدارس، انتشارِ ذہنی یا ذہنی انتشار، علومِ مشرق یا مشرقی علوم، اور تہذیبِ مغرب یا مغربی تہذیب۔

دوسرا بڑا مسئلہ انگریزیت کا بھوت ہے جو ہمارے چینلز اور انگلش میڈیم اداروں کے سر پہ سوار ہے۔ اردو میں مناسب اور درست متبادل یا مترادف ہونے کے باوجود اور گفتگو میں بھی انگریزی کو بلاوجہ گھسیڑا جاتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اردو الفاظ کی جمع بھی انگریزی قاعدے کے مطابق بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً شعروں کو شعرز یا کیلوں کو کیلاز کہنا۔ بنگلہ دیش اور بھارت میں تو رسم الخط کی تبدیلی اور تعصب کی بناء پر ویسے ہی اردو کے حالات اِس قدر خراب ہیں کہ وہاں اردو کو اپنی بقا کا مسئلہ درپیش ہے اور ہم، جن کی یہ قومی زبان ہے اسے انگریزی کی بلاضرورت ملاوٹ سے اپنے ہاتھوں بلاوجہ تباہ کر رہے ہیں اللہ اردو پر رحم کرے آمین۔

خادم حسین مجاہد

پرانے چاول

محمد خالد اختر

آپ کا کافی ہاؤس

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ ''انڈیا کافی ہاؤس'' کے بند ہونے کے کوئی دو ہفتے بعد سونادر میں عبدالغفور لانڈری ورکس کی بغل میں ایک نیا کافی ہاؤس معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس کافی ہاؤس کی زندگی چراغ سحری کی طرح بہت مختصر تھی اور یہ ایک کمزور دیے کی مانند چند ہی روز ٹمٹما کر ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔ میں اس افسوسناک واقعے میں ایک اہم کردار تھا۔ شاید آپ اس کافی ہاؤس کی پسِ پردہ، اصل کہانی سننا چاہیں گے۔

جب میں ایک روز شام کو چچا عبدالباقی سے گپ شپ کی خاطر اس کے گھر پر گیا تو میں نے اسے ہمیشہ کی طرح اپنے چیک کے سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز ایوننگ سینٹینل کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ اس کے چاند جیسے گول بدھ سے چہرے پر ایک قسم کا عرفانی نور پیدا ہورہا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اس کا موجب ''ایوننگ سینٹینل'' ہے۔

''بھتیجے!'' اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھو! میں تم سے ایک ضروری معاملے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے سنجیدہ انداز اور اس کی آنکھوں کی عجیب روشنی سے میں فوراً جان گیا کہ یہ ضروری معاملہ اس کی روپیہ کمانے کی کسی اور مجنونانہ اسکیم کے متعلق ہوگا۔ اخبار کی کسی خبر کے مضمون نے اس کے تخیل کو بھڑکا دیا ہوگا اور دولت پیدا کرنے کا کوئی اور طوفانی طریقہ اس کے پُر جدّت اور حیران کن دماغ میں آبسا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس کی ایسی سب اسکیموں کے لیے ایک سرمایہ لگانے والے حصے دار کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اور پچھلے دو تین سال سے وہ سرمایہ دار لامحالہ میں ہوتا رہا ہوں، اس لیے چچا کی اس ضروری معاملے میں مجھ سے مشورہ کرنے کی خواہش کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ دنیا میں واحد شخص ہے جو مجھ سے کاروباری معاملے میں، یا کسی بھی معاملے میں، مشورہ لیتا ہے، اور قدرتاً اس سے میرے جذبۂ خود

اہمیت کی تسکین ہوتی ہے۔

چچا عبدالباقی نے مجھے اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا ’’بھئی بختیار، تم نے ایوننگ سینٹینل میں یہ خبر دیکھی ہے کہ انڈیا کافی ہاؤس بند ہو گیا ہے، مینجمنٹ نے اسے خود بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔‘‘

میں نے اس خبر کو ’’ایوننگ سینٹینل‘‘ میں نہیں پڑھا تھا۔ میں ٹی ایل گلہری کے اخبار کو کم ہی پڑھتا ہوں لیکن بلاشبہ میں کافی ہاؤس کے بند ہونے کے سانحے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس سے مجھے ذاتی دھچکا لگا تھا اور فی الحقیقت میں انڈیا کافی ہاؤس میں روزانہ جانے والے اور وہاں گھنٹوں بیٹھے رہنے والے انٹلیکچوئلز میں سے تھا، جو اس کے بند ہو جانے سے اپنے آپ کو ایسے جہازوں کی طرح محسوس کر رہے تھے، جن کا لنگر نہ رہا ہو اور جن کو اس سانحے سے جانکاہ صدمہ پہنچا تھا۔ ان سے ان کی امان گاہ اور ان کے ملنے کا اڈہ چھین لیا گیا تھا۔

’’ہاں چچا!‘‘ میں نے دلی کرب سے جواب دیا۔ ’’آج اس کا آخری دن تھا۔ میں ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر ہی آ رہا ہوں۔‘‘

’’تم نے یہ بھی پڑھا ہے۔‘‘ چچا نے ایوننگ سینٹینل کے پرچے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ’’ٹی ایل گلہری نے اپنے غپ کے کالم میں لکھا ہے کہ حکومت نے کافی ہاؤس کو خود اپنی کارروائی سے بند کیا ہے، کیونکہ لمبے بالوں والے سوٹڈ بوٹڈ انٹلیکچوئل اور کمیونسٹ لوگ یہاں کافی کے سستا ہونے کی وجہ سے سارا سارا دن بیٹھے حکومت کے خلاف سازشیں پکاتے رہتے تھے اور لوگوں میں ہراس اور بے اطمینانی پھیلاتے تھے۔ گلہری نے کافی ہاؤس والوں پر یہ الزام بھی تھوپا ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کو کافی کے ساتھ کیشونٹ مہیا نہیں کرتے تھے، کیونکہ ہندوستان سے کیشونٹ آنے بند ہو گئے تھے۔ اس کی رائے میں یہ کافی ہاؤس والے ففتھ کالمسٹ تھے۔‘‘

’’گلہری کا یہ لکھنا اس کا حد درجہ اوچھا پن ہے!‘‘ میں نے بھڑکتے ہوئے کہا ’’اب جب وہ مجھے کبھی بازار میں جا تا مل گیا تو میں اس پر عملی طور پر واضح کروں گا کہ میری اس کے متعلق کیا رائے ہے۔۔۔ میں۔۔۔‘‘

’’سو تمھارا خیال ہے کہ گلہری نے جو کچھ لکھا ہے، جھوٹ ہے؟‘‘

’’جھوٹ ہے، سراسر کمینگی۔۔۔ لمبے بالوں والے انٹلیکچوئل! مجھے یقین ہے یہ میرے دوست جمیل پر حملہ ہے جو لمبے بال رکھتا ہے اور جو ہمیشہ کافی ہاؤس میں ملتا تھا۔ یہ گلہری کا ایک اوچھا وار ہے۔ حد درجہ کمینہ وار!‘‘

’’خیر، اس کو چھوڑو۔۔۔‘‘ چچا عبدالباقی نے اخبار کو کرسی پر رکھتے ہوئے اور اپنی چھوٹی ٹانگوں کو سامنے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا ’’ہاں! میں تم سے ایک ضروری بات پر مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی ابھی ایوننگ سینٹینل پڑھتے پڑھتے مجھے یہ خیال سوجھا ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ غالباً تمھیں روپیہ کمانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟‘‘

اپنی انوکھی بے مثال روپیہ کمانے والی ترکیبیں پیش کرنے سے پہلے چچا عبدالباقی ہمیشہ مجھ سے یہ سوال کرتا ہے۔ میں جان گیا کہ اب کیا آنے والا ہے۔ ایک دیوانے پن کی اسکیم، مجھے حصے دار بننے کی پیشکش۔۔۔ ’’ماہنامہ اُلّو‘‘ کے اجرا اور یوگنڈا سے وکٹوریاؤں اور تانگوں کے لیے زیبروں کی درآمد کی اسکیموں کی حسرتناک ناکامی نے مجھے چچا کی اسکیموں کے متعلق محتاط بنا دیا تھا۔ میں نے اب یہ فیصلہ کر لیا کہ چچا کو اگر صرف مشورے کی ضرورت ہے تو میں اس کو بخوشی اپنا مشورہ دوں گا، لیکن اگر اسے مشورے کے ساتھ سرمایہ لگانے والے حصے دار کی بھی ضرورت ہے تو اب کے وہ سرمایہ لگانے والا حصے دار محمد بختیار خلجی نہیں ہوگا۔

چچا عبدالباقی نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملاتے ہوئے مجھے کچھ بزرگانہ نصیحت دی ’’اِدھر دیکھو، بختیار بھتیجے! تم ابھی بچے ہو۔ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے کہ روپیہ کمانا کس قدر ضروری ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم پہ اس بات کا بوجھ سا رہتا ہے کہ تم اپنے والد کے روپئے پر جی رہے ہو۔ میاں، تو جوان آدمی ہو، ہمت کرو، کچھ کماؤ، روپیہ پیدا کرو، روپیہ! جب میرے جیسا شخص تمھیں لاکھ روپئے کے مشورے دینے کے لیے موجود ہے تو حیرت کی بات

ہے کہ تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔‘‘

میں نے روپیہ کمانے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

’’ماہنامہ اُلّو اور زیبروں کی اسکیم کی ناکامیابی سے مجھے جج نہ کرو!‘‘ عبدالباقی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ’’اس میں بدقسمتی سے ہمیں دوسرے لوگوں نے دھوکا دیا، اور تم بھی جلد دل چھوڑ گئے، ورنہ ہماری کامیابی یقینی تھی۔ اس نئے بزنس میں ہم بالکل اپنے آپ پر بھروسا کریں گے، اپنی لائنز پر اس کو چلائیں گے۔ اچھا! پچاس فیصدی منافعے میں حصہ تمھیں غالباً منظور ہوگا؟ نہیں تو تم پچپن، بلکہ ساٹھ فیصدی حصہ لے سکتے ہو۔ صرف تمھارے کہنے کی دیر ہے۔‘‘ عبدالباقی اپنے سرمایہ لگانے والے حصے داروں کو ہمیشہ شرائط دینے میں فیاضی دکھاتا ہے۔

’’اسکیم کیا ہے، سن تو لوں!‘‘

’’ویسے پچاس پچاس کی شرکت بالکل منصفانہ ہے۔ اگر تم ساٹھ فیصدی منافع لو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تم زیادہ روپیہ کماؤ گے، مگر تمھارا دل خوش نہ ہوگا، تمھارے ضمیر میں ایک خلش سی رہے گی کہ تم اپنے حصے دار سے منصفانہ سلوک نہیں کر رہے ہو۔ مان لیا کہ سرمایہ تمھارا ہوگا، لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ مینجمنٹ کی ذمہ داری کلّیتہً میری ہوگی اور اس سرمائے کو دوگنا اور تگنا کرنے کے پیچھے میرا دماغ کام کر رہا ہوگا، پچاس پچاس کی شرکت میرے خیال میں بالکل واجب ہے۔ میں مینجنگ ڈائریکٹر ہوں گا اور تم جنرل منیجر۔ تمھارے فرائض ہوں گے جگہ کو ٹپ ٹاپ رکھنا، بیروں کو مختلف میزیں نامزد کرنا، یہ بیرا ان میزوں پر کام کرے گا اور یہ ان پر، کافی اور کھانڈ کے اسٹاک کو محفوظ رکھنا۔‘‘

’’کافی اور کھانڈ، تمھارا مطلب ہے کہ۔۔۔‘‘

’’ہاں! انڈیا کافی ہاؤس کے بند ہونے کی خبر پڑھ کر مجھے سوجھا ہے کہ یہاں اب ایک نیا کافی ہاؤس خوب کامیاب ہوسکتا ہے۔ وہ سب انٹلکچوئل اور دوسرے لوگ جو انڈیا کافی ہاؤس میں جایا کرتے تھے، ہمارے کافی ہاؤس کو نوازیں گے۔۔۔ اور ہم ان کو کافی کے ساتھ کیشونٹ بھی مہیا کریں گے۔ لیکن بھتیجے، ہمیں جلدی کرنی ہوگی، پیشتر اس کے کہ کوئی اور اس معاملے میں پہل کر

گاما ایک دُور افتادہ گاؤں کے جاہل لوگوں میں ایک سیانا تھا۔ جب کبھی ان کو کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو کہتے چلو گاما سے پوچھ آئیں۔ گاما نے سفر بھی کیے تھے، بہت کچھ دیکھا تھا اور بہت سی چیزوں کے نام بھی اپنی ’’لال کتاب‘‘ میں لکھ رکھے تھے۔ ایک دفعہ گاؤں میں ایک مینڈک آیا۔ پہلے کسی نے مینڈک نہیں دیکھا تھا۔ اِن دنوں مینڈک شہر میں رہا کرتے تھے۔ کبھی کوئی جری مینڈک واسکوڈے گاما کا ہمسفر بن کر کسی نئی دنیا کو معلوم کرنے کے لئے گاؤں کا رُخ بھی کر لیا کرتا تھا۔ ہاں آپ کو مغالطہ نہ ہو، جس گاما کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ واسکوڈے گاما کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لوگ گاما کے پاس گئے اور مینڈک کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے اپنی کتاب نکالی اور لوگوں سے کہا کہ میری کتاب کے مطابق یہ چیز ہاتھی ہے یا امرود۔

افکارِ پریشان از جسٹس ایم آر کیانی

ڈالے یا کافی کو زندگی کا لازم سمجھنے والے انٹلکچوئل اس کے بغیر ہی جینے کے عادی ہو جائیں۔‘‘

یہ واقعی ایک معقول اور مضطرب کن تجویز تھی۔ لوگوں کو ان کا کافی ہاؤس واپس ملنا چاہیے! چچا عبدالباقی سے اپنی پہلی شرکتوں کی تاریخ کو بھول کر میں سوچنے لگا کہ یہ کافی ہاؤس عجیب چیز ہوگا۔ ایک شخص کافی ہاؤس میں ساری عمر خوش خوش گذار سکتا ہے۔ یہ چیز بالکل میرے مزاج کے مطابق ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قدرت نے میرے لیے اصل کیریئر یہی مقرر کر رکھا تھا۔ کافی ہاؤس کا جنرل منیجر۔ میں اپنی نئی پوزیشن میں اپنے کو متصور کر کے گلابی خواب دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ’’چچا، ہندوستان سے کافی درآمد کرنے میں ہمیں دقت ہوگی۔‘‘

’’دِقت کیا ہے؟‘‘ چچا عبدالباقی کے لیے ہر ایک چیز سہل ہوتی ہے ’’وزیرِ صنعت بھی میری طرح علیگڑھ کا اولڈ بوائے ہے۔ کل ایوننگ سینٹینل میں اس کی زندگی کے مختصر حالات سے مجھے یہ بات

معلوم ہوئی۔ آخر ایک پرانے علیگیرین کا اتنا بھی لحاظ نہ کریگا کہ کافی کی درآمد کا پرمٹ دینے سے انکار کردے۔ تم اس بات کی فکر نہ کرو، یہ سب تر ددات عبدالباقی پر چھوڑو۔ اگر بفرضِ محال ہم ہندوستان سے کافی درآمد نہ بھی کرسکیں تو گاہکوں کو ٹین کی کافی تیار کرکے پلائی جاسکتی ہے اور اس عرصے میں یہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم خود سندھ میں تمھارے باپ کے مربعوں میں کافی کی کاشت شروع کردیں گے۔''

''چچا! کافی تو صرف پہاڑی ڈھلانوں پر اور مرطوب آب و ہوا میں پیدا ہوتی ہے۔۔۔ سندھ میں۔۔۔''

''تت تت!'' عبدالباقی نے ایک پرندے کی سی عجیب آواز نکالی۔ ''جس زمین میں گندم اور کپاس اُگ سکتی ہے، اس میں کیا کچھ نہیں اُگایا جاسکتا؟ ابھی تک کسی نے اِدھر کافی کی کاشت کی کوشش ہی نہیں کی۔ میرے جو مربعے سندھ میں ہیں، ان میں دو تین ٹیلے بھی ہیں، ان کی ڈھلان پر تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ خیر، یہ تو بعد کا سوال ہے۔ پہلے تو ہمیں کافی ہاؤس کے لیے مناسب نام تجویز کرنا ہے۔''

''نام!'' میں نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا ''کیوں نہ چچا، تمھارے نام پر اس کا نام باقی کافی ہاؤس رکھ دیا جائے؟ باقی اور کافی ہم قافیہ بھی ہیں۔۔۔''

چچا عبدالباقی اس سے بظاہر خوش معلوم ہوتا تھا، مگر پھر اس نے کسرِ نفسی کا اظہار کیا ''نام تو موزوں ہے، اور پھر میرے دل میں تمھاری اس عقیدت کی قدر ہے، مگر میں ابھی اتنا بڑا آدمی نہیں کہ اس عزت کا اہل بنوں۔ اور پھر نام میں جدت ہونی چاہیے۔ جدت بزنس میں کامیابی کا پہلا راز ہے۔ کوئی دوسرا نام۔''

میں نے اسے کئی دوسرے نام تجویز کیے: پاک کافی ہاؤس، قائد کافی ہاؤس، روح افزا کافی ہاؤس۔۔۔ اس نے انھیں پسند نہ کیا۔

''بسم اللہ کافی ہاؤس؟''

''یہ کوئی برا نام نہیں، مگر بزنس کے نظریے سے اچھا نہیں رہے گا۔ مولوی طبقہ کافی پینے کا زیادہ عادی نہیں، جیسا کہ تم جانتے ہی ہو۔''

''آپ کا کافی ہاؤس؟'' میں نے ویسے ہی کہا۔

''بالکل یہی نام ہے!'' چچا عبدالباقی نے صاد کرتے ہوئے کہا ''اس نام میں جدت ہے۔ بس اب اللہ کا نام لے کر جنرل منیجر کی حیثیت سے ''آپ کا کافی ہاؤس'' کے سائن بورڈ کے لیے آرڈر دے دو۔''

''مگر چچا جگہ کہاں ہے؟ اور پھر روپے کا سوال ہے۔ میری مالی حالت آج کل بے حد خستہ ہے۔ کل ہی مجھے اپنے ٹیلر کا نوٹس ملا ہے۔''

''روپیہ!'' عبدالباقی نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''اپنے والد کو کہو کہ تمھیں دو ہزار روپے ادھار دے دیں۔ چمڑے کے نرخ ان دنوں تیز رہے ہیں اور اس نے خوب ہاتھ مارے ہوں گے۔ یہ انتظام تم کرو، اور باقی رہا جگہ کا سوال، سو جگہ میں دیتا ہوں۔ میرے ایک دوست محمد باقر کی سونادر میں آہنی پیچوں اور قبضوں وغیرہ کی دکان ہے، جو غالباً گھاٹے میں چل رہی ہے۔ محمد باقر بھی تمھاری ہی طرح میرا بھتیجا ہے۔ چند دنوں سے وہ دکان کو میرے چارج میں چھوڑ کر منٹگمری اپنے ماموں کی فاتحہ خوانی کے لیے گیا ہوا ہے۔ اس دکان کے سامان کو فی الحال اٹھوا کر تمھارے فلیٹ میں رکھا جاسکتا ہے اور تم چاہو تو سائیڈ لائن کے طور پر ان قبضوں اور پیچوں کی فروخت بھی کر سکتے ہو۔ ہم محمد باقر کی فروخت پر دس فیصدی کمیشن چارج کریں گے۔۔۔ آخر کمیشن تو ہمارا حق ہے۔ بزنس بزنس ہے۔''

''اور جب محمد باقر واپسی پر اپنے اسٹور کو کافی ہاؤس میں بدلا ہوا دیکھے گا تو۔۔۔''

''میں نے اس کی بابت سوچ لیا ہے۔'' چچا عبدالباقی نے اطمینان سے کہا ''میں اس کو راہ پر لے آؤں گا۔ آخر اس کی قبضوں کی دکان منافعے پر تو چل نہیں رہی ہے۔ اسے کافی ہاؤس میں دس فیصدی کا شریک بنالیں گے۔ معقول بھلا مانس ہے۔''

ہم نے اس معاملے پر کچھ دیر اور بحث کی اور جب میں اس کے گھر سے باہر نکلا تو میں چچا عبدالباقی کا سرمایہ لگانے والا حصے دار

بننے کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر قبلہ گاہی سے روپیہ حاصل کرنے کا سوال مجھے فکر مند کر رہا تھا۔

۲

میرا باپ ایک شفیق اور بامروت باپ ہے، پھر بھی بوڑھے آدمی سے دو ہزار روپے اگلوانے کا معاملہ ٹیڑھی کھیر تھا۔ اس کے لیے نہایت لطیف اور نازک پیرایۂ اظہار کی ضرورت تھی اور اس کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی نوجوان کر سکتے ہیں، جنھیں اپنے والد سے روپے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے پہلے بزنس کی کوششوں میں افسوسناک ناکامیوں کے بعد میں بوڑھے آدمی کی نگاہوں میں اپنا بھرم کھو بیٹھا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ مجھے روپیہ حوالے کرنا یا اسے بدرو میں بہا دینا برابر ہے۔ مجھے اب کے بڑا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا اور کئی ایک ڈوریں کھینچنی پڑیں۔

میں نے بوڑھے آدمی کو اپنے نئے بزنس کے بارے میں ذرا بھی اشارہ نہ دیا کہ وہ کس نوعیت کا ہے۔ میں نے اس امر کو مخفی رکھا کہ اس کا کافی ہاؤس سے کسی قسم کا تعلق ہے یا یہ کہ چچا عبدالباقی اس میں پچاس پچاس کا شریک ہے (یعنی منافعے میں)۔ بوڑھے آدمی کی چچا عبدالباقی کی کاروبارانہ صلاحیتوں کے متعلق جو رائے ہے، اسے اگر یہاں اس کے اپنے الفاظ میں لکھ دیا جائے تو شاید خوش مذاق پڑھنے والوں کی طبع پر گراں گذرے۔ بہرحال میرے باپ کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ جس کاروبار میں چچا عبدالباقی کا ہاتھ ہوگا، اس کی سو فیصدی ناکامی یقینی امر ہے۔

میں نے اور میری والدہ نے بوڑھے آدمی کو یقین دلایا کہ اس دفعہ میری کامیابی بالکل مسلّمہ ہے اور کامیابی میں شک کا ذرہ برابر بھی احتمال نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اب کے سب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے دو ہزار روپے مجھے دے دے۔۔۔ صرف دو ہزار روپے، اس سے ایک پائی زیادہ نہیں۔ میں انشاءاللہ تین چار مہینے میں اس روپے کو تگنا بنا لوں گا، اور اسے خاطر جمع رکھنا چاہیے کہ یہ دو ہزار روپے اسے مع سود کے لوٹا دیے جائیں گے۔ میں نے اس پر واضح کیا کہ یہ دو ہزار میں اس سے بطور قرض لوں گا، اور دس روپے کے اسٹامپ لگے ہوئے کاغذ پر اقرار نامہ لکھ کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دو ہزار روپے مجھے دے دے اور پھر میرے متعلق سب کچھ بھول جائے اور اگر اس کے بعد بھی کسی شخص نے اس سے روپیوں کے لیے کہا تو وہ شخص محمد بختیار خلجی نہ ہوگا۔

بوڑھے آدمی کا دل پسیجا (وہ فطرتاً نرم دل واقع ہوا ہے)۔ خدا جانے وہ میرے نئے دلائل سے مرعوب ہوا یا نہیں۔ بہرحال، اس نے مجھے دو ہزار کا چیک اپنے بینک کے نام بھجوا دیا۔ میں نے اسی روز اسے کیش کرایا اور نئے اور روح افزا کاغذوں سے ٹھنسی ہوئی جیبوں کے ساتھ، اور اپنے کو پہلے سے ڈگنا محسوس کرتا ہوا، چچا عبدالباقی کے مکان پر پہنچا تا کہ اسے یہ اچھی خبر سنا دوں۔

دوسرے دن صبح چچا عبدالباقی اور میں سونا در میں محمد باقر کی دکان پر پہنچے۔ محمد باقر ابھی تک منٹگمری سے نہیں لوٹا تھا۔ دکان مقفل تھی۔ چچا نے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک بڑا گچھا نکالا اور بہت سی چابیاں آزمانے کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی تاریک دکان تھی، جس میں لوہے کے حلقے، قبضے، قفل اور اسی قسم کی زنگ آلود چیزیں بھری پڑی تھیں۔ آدمی اندر بمشکل داخل ہو سکتا تھا۔ اس دکان کے دائیں طرف ایک پنساری کی دکان تھی۔ بائیں طرف عبدالغفور لانڈری ورکس تھی۔ میرا چہرہ ڈھل گیا اور میرے سارے جوش اور ولولوں پر اوس سی پڑ گئی۔

''تم اس دکان کو کافی ہاؤس بنانا چاہتے ہو؟'' میں نے چچا عبدالباقی سے کہا۔

''دیکھو نا۔۔۔'' چچا بولا۔ ''ذرا ان قبضوں وغیرہ کو باہر اٹھوا لینے دو، پھر تمھیں اندازہ ہوگا کہ یہ جگہ کتنی کھلی ہے۔ ایک کیا، یہاں تو پورے دو کافی ہاؤس بنائے جا سکتے۔ یہی ایک کمرہ تو نہیں، اس کے اوپر محمد باقر کا اپنا رہائشی کمرہ بھی ہے، اور میرا ارادہ ہے کہ اس کمرے کو بطور کافی روم کے استعمال کیا جائے۔۔۔ یہ تمھارا انڈیا کافی ہاؤس بھی تو دوسری منزل پر تھا۔''

میں اثبات میں کراہا۔

اوپر کا کمرہ بھی تقریباً دکان جتنا بڑا تھا۔ لحافوں، گٹھڑیوں اور

زنگ آلود لوہے سے ٹھنسا ہوا۔ اس میں چوہوں کی بو کے ساتھ ایک اور تیز بو رچی ہوئی تھی۔۔۔ سڑی ہوئی پیاز کی بو۔ عبدالباقی کے دوست کی کھاٹ کے نیچے پیاز کے دو بڑے گٹھے رکھے تھے اور ایک گھی کا ٹین بھی۔ ایک طاقچے پر مصالحوں کی پڑیاں اور ڈبے رکھے ہوئے تھے اور دو کتابیں ''لذت النکاح حصہ اول'' اور ''مشہور عالم جنتری'' اردو ادب کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ ایک کیل سے کھینچنے والے کسرتی اسپرنگ لٹک رہے تھے، جنھیں سینہ کشا کہا جاتا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں مگدروں کی جوڑی بھی رکھی تھی۔ اس سب متاع کو دیکھ کر میں محمد باقر کی ذہنی اور جسمانی ہیئت کا تقریباً اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوگا۔ میرے اندازے نے میرے دل پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا اور کچھ غشی کا سا احساس مجھ پر طاری ہونے لگا۔ مگدروں کو دیکھ کر میری طبیعت ہمیشہ گرنے لگتی ہے۔

''لو، یہ کیشونٹ فرائی کرنے کے لیے تمھارے پاس خالص گھی کا ٹین بھی موجود ہے!'' چچا عبدالباقی نے خوشی سے اپنی باچھیں چیرتے ہوئے چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے گھی کے ٹین کی طرف اشارہ کیا ''فی الحال اس کو استعمال کرو، باقر آیا تو اس کو اس کا حساب وغیرہ دے دیں گے۔ میرے خیال میں تو اسے کافی ہاؤس میں تیسرے کا حصے دار بنانا پڑے گا۔ اس سے کم پر وہ شاید راضی نہ ہو۔۔۔''

میں نے چچا کے ان ریمارکس کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

۳

فوراً ہی چچا عبدالباقی کی ہدایات کے ماتحت ''باقر قبضہ اسٹور'' کو کافی ہاؤس میں تبدیل کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ دو اونٹ گاڑیاں کرائے پر لی گئیں اور دکان کا کل سامان۔۔۔ قبضے، قفل، مگدر اور مصالحہ جات کے ڈبے اور کوئی آدھ درجن لحاف۔۔۔ ان میں لدوا کر میرے فلیٹ پر بھجوا دیا گیا۔ دو تین مزدور دیواروں کو سفیدی کرنے اور جگہ کو صاف کرنے پر لگا دیے گئے۔ مجھے خوب بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ یہ میری زندگی کا ایک نہایت مصروف دن تھا۔

عبدالغفور لانڈری ورکس میں ایک لمبی ناک والا شخص ایک ٹین کی کرسی پر بیٹھا اس ساری کارروائی کو قدرے مشکوک انداز سے تک رہا تھا۔ میں نے قیاس لگایا کہ یہ غالباً خود پروپرائٹر عبدالغفور ہے۔ اس کا انداز یقیناً دوستانہ نہ تھا اور جب میں اس کی طرف دیکھتا تو میرے دل میں ایک ڈوبنے کا سا احساس ہونے لگتا۔ وہ غالباً ہمیں چور یا نقب زن وغیرہ سمجھ رہا تھا، مگر ہماری دیدہ دلیری نے اسے کچھ کچھ شک میں ڈال دیا تھا۔

دوپہر کے بعد میں جب ''باقر قبضہ اسٹور'' کا بورڈ اتروا کر ''آپ کا کافی ہاؤس'' کا نیا بورڈ (جو اسی وقت پینٹر کے یہاں سے آیا تھا) اس کی جگہ لگوا رہا تھا، تو میرے کندھے پر ایک ہاتھ پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرا رنگ قدرے فق ہو گیا۔ یہ وہی لمبی ناک والا عبدالغفور لانڈری ورکس کا پروپرائٹر تھا۔ اس نے قمیص کی آستین چڑھا رکھی تھی۔

''معاف کیجیے!'' وہ بولا، ''آپ کون لوگ ہیں؟''

چچا عبدالباقی، جو دکان کے اندر دوسرے کاموں کی نگرانی کر رہا تھا، باہر آ گیا۔

''فرمائیے، کیا پوچھتے ہیں آپ؟'' چچا عبدالباقی نے اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھ کر عبدالغفور کو نہایت مرعوب کن انداز سے دیکھا۔

''اس دکان پر آپ نے کس طرح قبضہ کیا ہے؟''

''قبضہ؟'' عبدالباقی ہنسا۔ ''دکان ہماری اپنی ہے۔ محمد باقر میرا بھتیجا ہے۔ ہم اپنے لوہے کے سامان کو ایک اور دکان میں منتقل کر رہے ہیں اور اس دکان کو کافی ہاؤس بنا رہے ہیں...''

''بھائی باقر جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا تھا کہ میری دکان پر نگاہ رکھنا۔ اس لیے میں نے پوچھا تھا۔''

''اور ہم کو وہ دکان کی چابی دے کر گیا تھا۔'' چچا عبدالباقی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا ''اب آپ کی تسلی ہوگئی؟ آپ اس عبدالغفور لانڈری ورکس کے پروپرائٹر ہیں نا، گرم سوٹ کی دھلائی کیا لیتے ہیں آپ؟''

لانڈری ورکس والا چچا عبدالباقی کو دُھلائی کے نرخ بتا کر پھر فوراً اپنی دکان پر چڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کرسی کی پیٹھ ہماری طرف تھی اور اس نے قمیص کی آستینوں کو اتار دیا تھا۔

۴

چچا عبدالباقی غیر ضروری اخراجات سے حتیٰ الامکان احتراز کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ بزنس میں کامیابی کا یہ دوسرا راز ہے۔

غیر ضروری اخراجات سے بچنے کے لیے چچا کے مشورے کے مطابق میں اپنے فلیٹ سے اپنا بیشتر فرنیچر، دو دریاں اور ایک غالیچہ لدوا کر ''آپ کا کافی ہاؤس'' میں لے آیا۔ میرا فلیٹ اب خالی اور غیر آرام دہ نظر آنے لگا تھا۔ دو کمروں اور چھوٹے صحن میں تو ''باقر قبضہ اسٹور'' کا سامان پھیلا ہوا تھا اور زنگ آلود لوہے کی بو فضا پر طاری تھی۔ اس فلیٹ میں رہ کر اب کوئی بھی شخص اپنے دل کا چین قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔

جب میرا اپنا غالیچہ اوپری دکان کے بالائی کمرے میں بچھا دیا گیا تو چچا عبدالباقی نے ہاتھ ملتے ہوئے اور اپنے آپ کو، اپنی حسنِ کارکردگی پر تحسین کرنے کے انداز میں کہا ''یہ پہلا کافی ہاؤس ہوگا جس کے کافی روم کے فرش پر غالیچہ ہوگا۔''

نچلی دکان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ داخلے پر ایک چھوٹا سا کاؤنٹر بنا دیا گیا۔ چچا ایک سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کے ڈیلر سے ایک اسٹول اور ایک اونچا ڈرائنگ ڈیسک خرید لایا تھا۔ ایک پردہ دکان کے وسط میں لٹکا دیا گیا۔ اس کے پیچھے باورچی خانے کے لیے چولہے وغیرہ بنوا دیے گئے۔ دس کافی سیٹ جوڑیا بازار سے ایک تھوک فروش سے پہلے ہی روز خریدے جا چکے تھے۔ میں بھی اپنا چائے کا سیٹ فلیٹ سے یہیں لے آیا اور چچا عبدالباقی نے کمالِ فیاضی سے ایک بے ڈھنگی، بغیر ڈھکنے کی چائے دانی اور دودھ کا ایک قدرے شکستہ جگ کافی ہاؤس کو تحفتاً مرحمت فرمائے۔ تازہ کافی مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہم نے بازار سے ایک درجن نیس کیفے کے ڈبے خرید لیے اور کافی بنانے کے لیے میرے اپنے نوکر قادر بخش کو مقرر کر دیا گیا۔ چچا عبدالباقی نے ایک دو گھنٹے قادر بخش کو کافی پر جنرل لیکچر دینے اور یہ سمجھانے پر صرف کیے کہ کافی کے تیار کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور یہ کہ کافی کے بیجوں کو اچھی طرح پیسنا کیوں اس قدر ضروری ہے۔

''مگر چچا۔۔۔'' میں نے ٹوکا ''ہمارے پاس تو تازہ کافی کے بیج نہیں۔ اس ڈبوں کی کافی کو تو پیسنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بنانے کی ترکیب تو ایسی پیچیدہ نہیں۔''

''میں قادر بخش کو فی الحال کافی پر ایک جنرل لیکچر دے رہا تھا۔ یہ لیکچر اس وقت اس کے کام آئے گا جب ہماری زمین پر تازہ کافی اُگنے لگے گی اور ہم یہ ڈبوں کی کافی استعمال نہیں کریں گے۔ اس نیس کیفے کے بنانے کی ترکیب میں ابھی اس کو سمجھانے ہی والا تھا۔ ذرا مجھے نیس کیفے کا ایک ڈبا لا دو۔''

میں نے اسے ایک ڈبا لا کر دیا اور پھر اس پر لکھی ہوئی ہدایات کو ترجمہ کر کے قادر بخش کو ترکیب سمجھانے لگا۔

ابھی ہمارے گاہک آنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ ''آپ کا کافی ہاؤس'' سفیدی کے باوجود ابھی تک ایک حد درجہ اداس اور ممنوع کن سی جگہ تھی۔ فینائل کے فیاضانہ استعمال کے باوجود مرے ہوئے چوہوں اور سڑی ہوئی پیاز کی بو ابھی پوری طرح گئی نہ تھی۔ اس جگہ کو کافی ہاؤس میں تبدیل کرنے پر پانچ چھ سو روپے خرچ آ چکے تھے۔ اب میرے لیے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس بیل کے منڈھے چڑھنے کے آثار زیادہ روشن نہ تھے، مگر چچا عبدالباقی گرم جوش اور اعتماد سے پُر تھا۔

۵

میرا دلی چین اب رخصت ہو گیا۔ شام کو جب میں اپنے فلیٹ پر واپس لوٹتا تو میرے دل پر برچھیاں سی چلنے لگتیں۔ یہ رہنے کی ایک شریفانہ جگہ کے بجائے اب ایک زنگ آلود لوہے کے کباڑیے کا اسٹور بن گیا تھا۔

چچا عبدالباقی کے مشورے سے باقر کی دکان کا سائن بورڈ اب میرے فلیٹ کے دروازے پر لگا دیا گیا تھا ''باقر قبضہ اسٹور''۔

میرا خیال ہے ''آپ کا کافی ہاؤس'' کو وجود میں آئے ہوئے تیسرا ہی روز تھا۔ میں صبح دس بجے اپنے فلیٹ میں کافی ہاؤس

جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ دستک دینے والا ایک چھوٹا سا پھولا ہوا مینڈک نما شخص تھا۔ وہ ایک چھوٹا سیاہ کوٹ اور گول ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور جس پھرتی سے پان کی جگالی کر رہا تھا، وہ فی الواقع تعجب انگیز تھی۔

''تم اس قبضہ اسٹور کا مالک ہے؟'' اس نے ساتھ کی دیوار پر دلفریب پچکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اپنا مال کدھر ہے؟ گوڈاؤن کون باجو میں ہے؟''

''یہیں اندر ہے!'' میں نے اشارہ کیا۔

''ہم کو کچھ قبضہ وغیرہ چاہیے، مال نیا ہے یا جونا؟''

''اندر آ کر دیکھ لیجیے۔''

جس انداز سے وہ شخص اندر داخل ہوا اور جس بے تکلفی سے اس نے میرے غریب خانے کے فرش اور درو دیوار پر پیک کے بیل بوٹے بنائے، اس سے آپ یہ سمجھئے کہ یہ مکان ہی اس کا اپنا تھا۔ اس نے آ کر قبضوں پر نگاہ ڈالی اور کچھ سوچ کر بولا ''اپنے کو بیچنا ہے نا؟''

''ارادہ تو یہی ہے۔۔۔'' میں نے عبدالباقی کی ہدایات کو یاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

''مال جونا ہے۔'' اس نے دو تین قبضوں کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد سر ہلا کر کہا۔

اس نے ایک قبضہ اٹھایا ''یہ کتنا گراس ہے؟''

اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ دروازوں کے قبضوں کی فروخت سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ابھی تک مجھے قبضہ خریدنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ کس نرخ پر فروخت ہوتے ہیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس شخص کو پھر شام کو آنے کے لیے کہوں گا اور جا کر چچا عبدالباقی سے مشورہ کروں گا کہ ان کو کس بھاؤ پر بیچا جا سکتا ہے، لیکن پھر غالباً یہ خیال کر کے کہ ایک کاروباری آدمی کو سوجھ بوجھ کا ثبوت دینا چاہیے۔ میں نے ویسے ہی کہہ دیا ''پانچ آنے۔''

''پانچ آنے گراس؟'' اس آدمی نے کہا۔

''پانچ آنے گراس!'' میں نے جواب دیا۔

میں نے اسے اپنی طرف سے ایک قبضے کے دام بتائے تھے اور اب میں ایسے گراس کے لیے اپنی زبان دے چکا تھا۔ اسکول میں حساب میں خاص طور سے کمزور ہونے کی وجہ سے گراس کے متعلق میرا اندازہ کچھ دھندلا تھا۔ درجن کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ اس میں بارہ ہوتے ہیں، مگر گراس؟ غالباً تین چار۔

اس نے مجھ سے پھر پیچوں، کیلوں اور کنڈوں وغیرہ کے نرخ پوچھے اور میں نے اسے اسی طرح ویسے ہی نرخ بتا دیے۔ ان چیزوں کے دام بتاتے وقت میں نے نرخ کچھ اونچے رکھے۔ کچھ وقفے کے بعد اس شخص نے کہا کہ وہ ابھی ایک منٹ میں آتا ہے۔ دو تین منٹ کے بعد وہ واپس لوٹا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک دوہری ٹھوڑی اور چوبی چہرے والا شخص تھا۔ ان کے پیچھے پانچ چھ مزدور ٹوکریاں اور تھیلے لیے ہوئے تھے۔ وہ مجھے نظر انداز کر کے گن گن کر پیچوں اور قبضوں کو بوریوں میں بھرنے لگے، اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ گراس میں بارہ درجن ہوتے ہیں۔ زمین میرے پاؤں سے نکل گئی۔

میں نے بڑبڑانے کی کوشش کی ''میں نے ایک درجن کے نرخ بتائے تھے۔'' مگر میرے یہ الفاظ غالباً ناقابلِ سماعت تھے۔ میں خود بھی ان کو اچھی طرح نہیں سن پایا۔

مزدور بوریاں بھر کے نیچے لے گئے اور جلد ہی خالی بوریاں لے کر اوپر آ گئے۔ مختصراً یہ کہ محمد باقر کا تین چوتھائی اسٹور ان دو میمنوں نے پینتالیس روپے کچھ آنے کے عوض خرید لیا۔ جاتے وقت ایک میمن نے دوسرے کو کہنی ماری اور پہلا میرے صحن کے فرش پر ملمع کاری کرتے ہوئے بولا ''ہمارا دکان اِدھر سامنے ہی میمن مسجد کے باجو میں ہے۔۔۔ حاجی حسین بھائی قاسم بھائی۔ تمھارا نیا اسٹاک آئے تو ہم کو بولو۔'' اس نے مجھے فیاضی سے ایک بیڑی پیش کی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے حساب لگایا۔ پینتالیس روپے میں ہمارا فروخت کا کمیشن دس فیصدی کے حساب سے

تقریباً ساڑھے چار روپے تھا۔ اس ساڑھے چار روپے میں میں اور چچا پچاس پچاس کے حصے دار تھے۔

کافی ہاؤس جانے پر جب میں نے چچا عبدالباقی سے باقر کے مال کی فروخت کے متعلق بتایا اور اسے وہ نرخ بتائے جس پر میں نے مال کو بیچا تھا تو اس نے زیادہ ناخوشی کا اظہار نہ کیا۔ دراصل اسے لوہے کے قبضوں وغیرہ کے بھاؤ کا بھی مطلق اندازہ نہ تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ گراس کتنے کا ہوتا ہے۔ شام کو ایک آہن فروش سے پوچھ گچھ کرنے پر مجھے یہ پتہ چلا کہ میمنوں نے مجھے خوب بیوقوف بنایا تھا اور ڈھائی تین ہزار کا مال ساڑھے پینتالیس روپے میں مار لے گئے تھے۔

۶

باقر قبضہ اسٹور کو کافی ہاؤس میں تبدیل ہوئے غالباً چوتھا روز تھا۔ میں کاؤنٹر کے اسٹور پر بیٹھا صبح سے گاہکوں کا انتظار کرتا کرتا تھک گیا تھا۔ میں ہر لمبے بالوں والے دبلے، انٹلکچوئل قسم کے شخص کو جو سامنے سے گذرتا پرامید نظروں سے دیکھتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اندر آنے کی دعوت دیتا۔ یہ سب لوگ ہمارے بورڈ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر منہ میری طرف پھیر لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انٹلکچوئل حضرات کے لیے اب کافی کا لفظ کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔

تین بیرے جنھیں ہم نے دو روپے روز، گاہکوں کے ٹپ میں پچاس پچاس کی شرکت اور کافی کے لامحدود پیالوں پر ملازم رکھا تھا، بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ وہ مجھے کچھ کچھ تمسخرانہ انداز سے دیکھ رہے تھے اور ان کے اس گستاخانہ انداز نے مجھے اپنے اسٹول پر بے چین کر دیا تھا۔ (یہ ایک اونچا سخت غیر آرام دہ اسٹول تھا، اس قسم کا اسٹول جو عموماً اسپتالوں میں نظر آتا ہے۔) چچا عبدالباقی ہر پانچویں منٹ اوپر کافی روم سے (جہاں اس نے باقر کے غسل خانے کو اپنا آفس بنا رکھا تھا) اپنے ہاتھ ملتا ہوا اور چہرے پر ایک تلطف آمیز پروپرائٹرانہ مسکراہٹ لیے نیچے کاؤنٹر پر آتا اور مجھ سے دریافت کرتا کہ بزنس کیسا ہو رہا ہے۔ پانچ بجے شام تک چچا اور میں کافی کے پانچ پانچ پیالے پی چکے تھے۔ ان کے دام ہمارے حساب میں درج کر دیے گئے تھے، کیونکہ انتظامیہ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں یہ طے کیا جا چکا تھا کہ ہم کافی مفت نہیں پئیں گے، بلکہ اس کے دام ادا کریں گے۔ بیروں کو دو دو کافی کے پیالے ان کی خوش طبعی اور آسودہ دلی کو برقرار رکھنے کے لیے ہمارے حساب میں پلائے گئے تھے۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب ایک باریک مونچھوں والا، بلغمی مزاج شخص ایک ہاتھ میں تھیلا اور دوسرے میں ٹوکری اٹھائے اندر آیا۔

میں نے پرامید میزبانہ خوش خلقی سے کہا، ''اوپر تشریف لے چلئے۔ کافی روم اوپر ہے۔''

بیرے تیزی سے اپنی بیزاری کو جھاڑتے ہوئے اٹھے۔

''معاف کیجیے۔'' اس شخص نے تھیلے اور ٹوکری کو اوپر کاؤنٹر پر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا ''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

تھیلے میں لہسن، تھوم، مولیاں اور گاجریں وغیرہ تھیں اور ٹوکری میں سے ایک مرغی اپنی بٹنوں سی گول آنکھوں سے باہر جھانک رہی تھی۔

''فرمایئے!'' میں نے کہا۔ مرغی پھڑ پھڑاتی اور کٹکٹاتی ہوئی ٹوکری میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے بات کرتے وقت اپنی ایک آنکھ اس کی طرف رکھنا پڑی۔

''یہ اس دکان پر آپ نے قبضہ کیسے کیا؟ یہ دکان تو میرے خالو مولوی محمد باقر کی ہے۔''

''دکان تو انھی کی ہے۔'' میں نے جواب دیا ''صرف اسے قبضہ اسٹور سے کافی ہاؤس بنا دیا گیا ہے۔ محمد باقر صاحب بھی اس میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔''

''عجیب قصہ ہے۔ وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ کل ہی ان کا مجھے منٹگمری سے خط ملا کہ میری دکان کا خیال رکھنا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

مرغی ٹوکری کی جالی میں سے آدھی باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی

تھی۔ محمد باقر کے بھانجے نے اسے دوبارہ نیچے دبا دیا۔ اتنے میں چچا عبدالباقی اپنے ہاتھ ملتا ہوا مجھ سے بزنس کا حال پوچھنے اور کافی کا ایک پیالہ پینے کے لیے نیچے آیا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے محمد باقر کے بھانجے کو اس کے حوالے کر دیا۔

''یہ صاحب محمد باقر صاحب کے بھانجے ہیں۔'' میں نے بلغمی مزاج شخص کو چچا سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔

''آیئے، آیئے! آپ باقر صاحب کے بھانجے ہیں؟'' چچا نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''آیئے نا، اوپر آفس میں تشریف لے چلئے۔ بھئی بختیار، دو کافی اوپر بھجواؤ اور ایک پلیٹ کیشونٹ بھی۔۔۔''

نووارد اور چچا اوپر سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ نووارد آگے آگے اور مڑ مڑ کر اپنے سبزی کے تھیلے اور مرغی کی طرف نگاہ ڈالتا ہوا، چچا اس کے پیچھے اس کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیتا اور دھکیلتا ہوا۔ میں نے ایک بیرے کو فوراً کافی اور کیشونٹ اوپر لے جانے کے لیے کہا۔ باقر کا بھانجا کوئی بیس منٹ اوپر رہا اور میں اس عرصے میں اس کی مرغی کی حفاظت کرتا رہا جو ٹوکری سے بار بار باہر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بیس منٹ کے بعد بھانجا نیچے آیا۔ وہ سراپا مسکراہٹ تھا۔ اس کے ہونٹ چکنے تھے اور کیشونٹ کے دو ذرّے اس کی مونچھوں میں چپکے ہوئے تھے۔ چچا عبدالباقی سے وہ بار بار ہاتھ ملا رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ وہ اسے دکان سے باہر پہنچانے کی زحمت نہ کرے۔ وہ اس قدر بشاش اور مطمئن معلوم ہوتا تھا کہ جب وہ میرے سامنے سے گذرا تو اس کی چال ایک خاص قسم کے انگریزی رقص ''والز'' سے مشابہ تھی۔ وہ پہلی بار ناچتا ہوا دکان کے نیچے اتر گیا اور اپنے تھیلے اور ٹوکری کو میرے کاؤنٹر پر بھول گیا۔ اسے ان کے لیے واپس آنا پڑا۔

جب وہ چلا گیا تو چچا عبدالباقی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا ''میاں، کاروباری آدمی بنو۔ آدمیوں سے نبٹنا سیکھو۔ اب دیکھو، اس کو منٹوں میں سیدھا کیا ہے۔ کیسے اطمینان سے گیا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ باقر اور ہم نے مل کر یہ کافی ہاؤس کھولا ہے اور یہ کہ اس کے قبضوں کے سامان کی دکان کو کھارا در میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ باقر میرا اپنا بھتیجا ہے۔''

چچا عبدالباقی کی پروقار بزرگانہ شخصیت ہر شخص کو مرعوب اور گرویدہ کر لیتی ہے اور اس کا گول معصوم دوستانہ چہرہ ہر کس و ناکس کا دل جیت لیتا ہے—اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''ذرا اوپر آفس میں آؤ!'' چچا عبدالباقی نے مجھے ہدایت دی ''اب ذرا ہائی لیول پر حصے داروں کی میٹنگ ہو جائے۔''

جب ہم اوپر چچا کے آفس میں بیٹھ گئے، چچا اپنی کرسی میں اور میں سامنے میز کے اوپر۔۔۔ تو چچا نے بحیثیت منیجنگ ڈائریکٹر مجھ سے استفسار کیا ''آج بزنس پوزیشن کیسی تھی؟'' جیسے کہ وہ خود نہ جانتا ہو۔

''بارہ کافی کے پیالے بکے ہیں۔۔۔'' میں نے جواب دیا ''پانچ تم نے پیے ہیں، پانچ میں نے، اور دو تم نے بعد میں اوپر باقر کے بھانجے کی تواضع کرنے کے لیے منگوائے تھے، اور ہاں ایک پلیٹ کیشونٹ بھی۔''

''بزنس کچھ مدھم ہو رہا ہے۔'' چچا نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا، اور اس انداز سے جیسے بزنس کبھی تیز بھی رہا ہو ''اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ تمھارے پاس قدردوست، فنکار، ادیب اور آرٹسٹ وغیرہ ہیں۔ ان کو کہا کرو تاکہ یہاں آیا کریں اور دن کا بیشتر حصہ یہاں گذارا کریں۔ ان کے یہاں آنے سے یہاں کی فضا انٹلیکچوئل ہو جائے گی اور پھر خود بخود لوگ یہاں ٹوٹ پڑیں گے۔''

''میں کوشش کروں گا!'' میں نے بے دلی سے کہا۔

اور پھر ہم نے پبلسٹی بھی تو نہیں کی۔ لوگوں کو پتہ نہیں کہ نیا کافی ہاؤس کہاں ہے۔ ذرا سوچو، محض اس وجہ سے کہ لوگوں کو اس جگہ کا پتہ نہیں، آج کتنے آرٹسٹ اور انٹلیکچوئل صدر اور الفنسٹن اسٹریٹ میں بھٹکے بھٹکے اور اُداس پھر رہے ہوں گے۔ پبلسٹی بڑی ضروری چیز ہے، یہ کاغذ اور قلم لو، ایوننگ سینٹینل کے لیے ایک اشتہار لکھو۔''

میں نے کاغذ لے کر چچا کی ڈکٹیشن کے مطابق لکھنا شروع

کیا۔

''انڈیا کافی ہاؤس بند ہوگیا تو آپ مایوس کیوں ہیں؟ آپ کیوں اداس سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں؟ آپ کیوں ایسی پناہ کے لیے آہیں بھرتے ہیں جہاں آپ کافی کے ایک مفرح پیالے میں اپنے آلام اور اپنے غم ڈبو سکیں؟ جس پناہ گاہ کے آپ متلاشی ہیں وہ آپ کے قریب ہی تو ہے۔۔۔ سونا در میں عبدالغفور لانڈری ورکس کے بالکل بازو میں۔ یہاں آپ کو شہر میں بہترین کافی ملے گی، یہاں آپ کو خالص گھی میں تلے ہوئے کیشونٹ بھی ملیں گے۔۔۔ ہاں، کیشونٹ! مینجنگ ڈائریکٹر اور جنرل منیجر دونوں آپ سے خوش خلقی سے پیش آئیں گے۔ دستخط، مینجنگ ڈائریکٹر، ایچ اے باقی۔''

''اس اشتہار کو ابھی ایوننگ سینٹینل کے دفتر بھجوادو!'' چچا نے کہا ''چوتھائی کالم کے غالباً پچپن روپے لگیں گے۔''

''پچپن۔۔۔'' میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرا۔۔۔ میرے باپ کا قیمتی پسینے سے کمایا ہوا روپیہ بدرو میں بہایا جا رہا تھا۔ چچا نے مجھے روکا۔

''ہاں ٹھہرو، بھئی بختیار، میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ کل ''آپ کا کافی ہاؤس'' کا یومِ افتتاح منایا جائے۔ اس سے خوب پبلسٹی ہوگی۔ یہ یومِ افتتاح کا تو ہمیں خیال ہی نہ آیا تھا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی چیز ہم بھول گئے ہیں۔ اشتہار میں اس کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ ہاں یہ بتاؤ افتتاح کس سے کرایا جائے؟''

''کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا ''اگر کوئی منسٹر ہو تو بہت اچھا ہے، وزیرِ صنعت وحرفت پرانا علیگیرین ہے۔''

''وزیرِ صنعت غالباً آج کل دورے پر ہے!'' عبدالباقی بولا ''سکھر میں بسکٹ فیکٹری والوں نے ہڑتال کر دی ہے۔ اس صورت میں اس کے پارلیمنٹری سیکرٹری سے کام چل جائے گا۔''

''وہ اس کے ساتھ گیا ہوگا۔''

مجھے سوجھا ''افتتاح کے لیے کیوں نہ ہمارے موقر روزناموں کے مدیروں میں سے ایک کو مدعو کرلیا جائے۔ مثلاً انعام کا قلندر بخش، ایوننگ سینٹینل کا ٹی ایل گلہری، تکبیر کا حاجی۔۔۔''

''بس، ٹی ایل گلہری ٹھیک رہے گا۔ اشتہار بھی ہم اسی کے اخبار میں دے رہے ہیں۔ حکومت میں اس کا اچھا رسوخ ہے اور اسے ہاتھ میں رکھنا مفید ہوگا۔ اچھا، اشتہار میں یہ فقرہ بڑھا دو کہ ایوننگ سینٹینل کے ایڈیٹر مسٹر ٹی ایل گلہری کل شام کو چھ بجے ''آپ کا کافی ہاؤس' کا افتتاح فرمائیں گے، سب کو محبت سے مدعو کیا جاتا ہے۔''

''لیکن پہلے ہمیں گلہری سے تو پوچھ لینا چاہیے۔'' میں نے کہا ''فرض کرو، وہ انکار کردے؟''

''یہ مجھ پر چھوڑو!'' چچا عبدالباقی نے اٹھتے ہوئے کہا ''یہ اشتہار کا مضمون بھی مجھے دو۔ میں ابھی سیدھا گلہری کے پاس جاتا ہوں اور اس سے فیصلہ کیے آتا ہوں۔ کوئی وجہ ہے کہ نہ آئے؟ آخر ہم اس کی عزت افزائی کر رہے ہیں، اور مجھے اشتہار کے لیے ساٹھ روپے بھی چاہئیں۔''

عبدالباقی اسی وقت ٹیکسی میں ایوننگ سینٹینل کے دفتر چلا گیا۔ چچا کی خود اعتمادی اور بشاشت مجھے بھی لگ گئی تھی اور میں اس وقت گانے کے موڈ میں تھا، لیکن جس گیت کے بول ابھی میرے ہونٹوں پر تھے، عبدالغفور لانڈری ورکس کی طرف نظر دوڑانے سے ختم ہوگئے۔ وہی باقر کا بھانجا جو آدھ گھنٹے پہلے سراپا بشاشت کی تصویر بنا ہوا ہمارے کافی ہاؤس کی سیڑھیوں پر ناچتا ہوا اترا تھا، وہاں موجود تھا اور لمبی ناک والا عبدالغفور، جس نے پھر آستینیں چڑھا لی تھیں، میری طرف قاتلانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چچا عبدالباقی کا کیا ہوا جادو اُتر چکا تھا اور ان کے اصل شبہات پھر عود کر آئے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ باقر کے بھانجے کے فل بوٹوں کے تلووں میں موٹی کیلیں ٹھکی ہوئی ہیں اور غالباً کسی تحت الشعوری جذبے کے تحت میں اپنا سر کھجانے لگا۔

۵

یومِ افتتاح کے لیے ہمیں کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ چچا عبدالباقی کے مکان سے وہ تاریخی صوفے منگوائے گئے، جن کے اسپرنگ اب ٹھوس ہو چکے تھے اور جن پر یک لخت بیٹھنے سے ایک

ناخوشگوار تعجب ہوتا تھا۔ ایک وائرلیس کمپنی سے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا گیا تا کہ بازار میں لوگ افتتاحیہ کارروائی اور مسٹر گلہری کی افتتاحیہ تقریر سننے سے محروم نہ رہ جائیں۔ چچا عبدالباقی کی معزز و پروقار شخصیت سے متاثر ہو کر گلہری نے مع اپنی بیوی کے ''آپ کا کافی ہاؤس'' میں آنے اور اس کا باقاعدہ افتتاح کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں چار پانچ گھنٹے اپنے انٹلیکچوئل دوستوں کے گھروں میں ان کا کھوج لگاتا پھرا۔ ہم چاہتے تھے کہ افتتاح پر اچھا خاصا مجمع ہو جائے۔ میرے دوستوں میں سے بیشتر نے معذرت کی کہ وہ شام کو مصروف ہیں اور افتتاح میں شمولیت نہیں کر سکتے، لیکن یقین دلانے پر کہ کافی بالکل مفت ہوگی، انھوں نے میری دوستی کی خاطر اپنی مختلف مصروفیات کو کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھا اور آنے کا وعدہ کیا۔ اچھا ہوا کہ یہ لوگ آگئے، ورنہ غالباً گلہری کو اپنی افتتاحیہ تقریر صرف منتظمین اور بیروں کے سامنے کرنی پڑتی۔

افتتاح کے وقت سے ذرا پہلے چچا عبدالباقی کو خیال آیا کہ گلہری کے لیے ایک بینڈ بھی ہونا چاہیے۔ اتفاق سے پاس ہی کوئی شادی تھی، وہاں سے دو بینڈ والوں کو بڑی منت سے پندرہ منٹ کے لیے بہلا پھسلا کر لایا گیا۔ ایک طوطی والا تھا، دوسرا چھن چھن بجنے والی تھالیوں والا۔ انھوں نے آتے ہی دھوم دھام سے اپنا کام شروع کر دیا۔ ہم گلہری کا ایک باقاعدہ شاہانہ سواگت کرنا چاہتے تھے۔

چھ بج کر پانچ منٹ پر مسٹر گلہری اور مسز گلہری اپنے سر کھڑکی میں سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ٹیکسی میں سے وہاں سے گذرے۔ وہ افتتاحیہ جگہ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے آگے جا رہے تھے کہ چچا عبدالباقی نے بازو ہلا کر اور ایک نعرہ لگا کر ان کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ جب گلہری اور مسز گلہری ٹیکسی میں سے اترے تو ہمارے بینڈ والے ''تیرا بند گلو بندنی، ہے جمالو'' کا گیت بجا رہے تھے اور چچا اور میں اور میرے آدھ درجن دوست ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے گلہریوں کے استقبال کے لیے تیار تھے۔

افتتاحیہ شام کی کارروائی کی روئیداد ہماری مینجمنٹ فائلز میں مکمل طور سے درج ہے۔ یہاں اتنا ہی لکھوں گا کہ ٹی ایل گلہری اپنے استقبال کی وجہ سے بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے ایوننگ سینٹینل کے ایڈیٹر کی حیثیت میں اسے دیکھنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا کیونکہ اس کے بعد جلد ہی ایوننگ سینٹینل بند ہو گیا اور گلہری کو جنوبی امریکہ کی کسی ریاست میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ ٹی ایل گلہری جسمانی طور پر اپنے نام کی توقعات پوری کر رہا تھا اور حیرتناک طور پر گلہری سے مشابہ تھا۔ مسز گلہری ایک بھاری جثّے کی مغلوب کن انگریز عورت تھی، گلہری سے آٹھ دس سال بڑی۔ اس کا چہرہ دلیر زاویوں پر مشتمل تھا۔ صحافتی حلقوں میں یہ مشہور تھا کہ مسٹر گلہری نے اس عورت سے اس لیے شادی کی تھی کہ وہ گلہری کے اداریوں کی انگریزی کو صاف اور درست کر سکے۔ ایوننگ سینٹینل کے اداریے عموماً مسز گلہری ہی لکھا کرتی تھی۔

گلہری نے کافی نوشی کے بعد اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اسے اس کافی ہاؤس کا افتتاح کرتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے اور وہ امید کرتا ہے کہ یہ کافی ہاؤس پاکستان کی ثقافتی اور تمدنی ترقی میں قابلِ قدر حصہ لے گا۔ اس نے چچا عبدالباقی کی انتظامی قابلیت کے متعلق بھی چند لفظ کہے۔

گلہری نے دوسرے دن اپنے گپ شپ کے کالم میں ''آپ کا کافی ہاؤس' کا ذکر کر کے ہمارا حق کافی ادا کر دیا۔ اس نے اپنے اخبار پڑھنے والوں سے سفارش کی کہ وہ اس کافی ہاؤس کو پیٹرنائز کریں، اور پروپرائٹر کو کافی کے ساتھ کیشونٹ مہیا کرنے پر سراہا۔ اسی کالم میں وزیرِ خوراک کی توجہ کافی ہاؤس کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس نے اسے (وزیرِ خوراک کو) مشورہ دیا کہ ہمیں کافی اور کھانڈ مہیا کرنے میں پوری دریا دلی سے کام لیا جائے، کیونکہ کافی ہاؤس ملک کے تمدن کو ابھارنے میں حکومتوں سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ اس نے مینجنگ ڈائریکٹر عبدالباقی کے جذبہ حُبّ الوطنی کی تعریف کی اور تسلیم کیا کہ عبدالباقی صاحب نے ان نامساعد حالات میں ملک کی کلچری بہتری کے لیے ایک نہایت مفید قدم اٹھایا ہے۔ اس کالم کو چار پانچ مرتبہ پڑھنے کے باوجود مجھے اپنا نام کہیں نظر نہ آیا۔

۸

مگر افتتاحیہ ڈے کے باوجود، مسٹر گلہری کی گپ شپ کے کالم میں پبلک اور حکومت سے سفارش کے باوجود، کاروبار مدھم ہی رہا (سوائے ان پیالوں کے جو چچا عبدالباقی اور میں پیتے تھے)۔ مجھے زیادہ پینے سے شب بیداری کی شکایت ہوگئی اور چچا عبدالباقی، جو کافی کا عادی نہ تھا، اپنے سر اور معدے میں کچھ مبہم آوازیں سننے لگا۔ ہمارا چینی کا اسٹاک بھی تقریباً ختم ہو چلا تھا۔ اب تک ہم اپنے ذاتی راشن کی چینی سے کام چلا رہے تھے۔ کافی ہاؤس کے لیے چینی کے پرمٹ کی جو ہم نے درخواست دی تھی، اس کا کچھ نہیں بنا تھا۔

چچا عبدالباقی کی خوداعتمادی میں ذرہ بھر کمی نہ آئی تھی۔

جب میں اپنے دوستوں کو ''آپ کا کافی ہاؤس'' میں آ کر کافی پینے پر نہ اکسا سکا، تو ایوننگ سینٹینل میں ایک اشتہار دیا گیا کہ ہم کو چند لمبے بالوں والے انٹلیکچوئل لوگوں کی ضرورت ہے جن کا کام سارا دن کافی ہاؤس میں بیٹھنا ہوگا۔ ان کو مفت کافی اور آٹھ آنے یومیہ دیا جائے گا۔ چچا کا خیال تھا کہ یہ لوگ ایک طرح تحریص کے دانے کا کام دیں گے، جس سے دوسرے انٹلیکچوئل یہاں رفتہ رفتہ آنے لگیں گے۔ جب سے ٹی ایل گلہری نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اس کی انتظامی قابلیت کی تعریف کی تھی، چچا عبدالباقی کی اپنی کاروباری صلاحیتوں کے لیے رائے پہلے سے دوچند ہوگئی تھی۔

ایوننگ سینٹینل میں اشتہار کا اثر یہ ہوا کہ اس کے دوسرے روز جب میں کافی ہاؤس پہنچا تو اس کے باہر وحشی آنکھوں اور پھیلے ہوئے متوحش بالوں والے نوجوانوں کا ایک ہجوم تھا۔ چچا عبدالباقی سارا دن ان سے ایک ایک کر کے اپنے آفس میں انٹرویو کرتا رہا اور بالآخر چار انٹلیکچوئل جن کے بال کمر تک آتے تھے اور جو کالرج کی نظم ''کبلا خاں'' کے شاعر کی طرح شہد آگیں شبنم اور بہشت کے دودھ پر پلے ہوئے معلوم ہوتے تھے، منتخب کر لیے گئے۔

ان کے آنے سے یہ ہوا کہ کافی ہاؤس کی رونق بڑھ گئی، مگر کافی کی مقدار جو وہ پی سکنے کے اہل تھے، واقعی حیران کن تھی۔ ان میں سے ہر ایک پندرہ بیس پیالے پی جانے کو مذاق سمجھتا تھا۔ (ان میں سے ایک کا تو پہلے روز ہی گھر جا کر انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے دو درجن پیالے پی ڈالے تھے۔)

مجھے یاد ہے، جب ہمارے پہلے گاہک آئے، انھوں نے اپنے سائیکل چوکیدار کے پاس چھوڑے۔ (یہ چوکیدار چچا کی دریافتوں میں سے ایک تھا۔) جب وہ کافی پی کر نیچے اترے تو چوکیدار غائب ہو چکا تھا۔۔۔ ان کی سائیکلوں سمیت۔ انھوں نے بڑا ہلڑ مچایا۔ چچا عبدالباقی اور مجھ کو الزام دیا کہ ہم نے خود چوری کروائی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ پولیس مین ہاتھوں میں نوٹ بکیں لیے ہوئے آئے اور میرے اور چچا کے پتے اور پچھلی سوانح عمریاں نوٹ کرنے لگے۔

میرے دو ہزار روپے میں سے بارہ سو روپے بدرو میں جا چکے تھے۔ (چار سو تو افتتاحیہ ڈے ہی کی نذر ہو گئے۔) چچا عبدالباقی کی بشاشت بدستور قائم تھی، مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ 'آپ کا کافی ہاؤس' کے معاملات ایک بحران میں پہنچ رہے ہیں اور میں آخری خاتمے کا انتظار کر رہا تھا۔

۹

آپ کا کافی ہاؤس وجود میں آئے بارھواں دن تھا۔ شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے اور میں کاؤنٹر کے اسٹول پر بیٹھا بوڑھے آدمی کو خط لکھ رہا تھا کہ میرا بزنس خوب کامیاب ہو رہا ہے، مگر اس کو بالکل مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے فقط ایک ہزار روپیہ اور درکار ہوگا۔ چچا عبدالباقی اوپر اپنے آفس میں تھا، گاہک

ایک جنرل صاحب کسی فوجی میس کے دورے پر آئے۔ معائنے کے بعد اُنھوں نے کیڈٹوں سے اپنے مختصر خطاب میں پوچھا ''آپ لوگوں کا کوئی مسئلہ؟'' ایک کیڈٹ نے کھڑے ہو کر کہا ''سر! ہمیں میس میں جو سوپ دیا جاتا ہے اس میں ریت بہت ہوتی ہے۔'' جنرل صاحب اُس پر گرجے ''تم لوگ یہاں ملک کی خدمت کرنے آئے ہو یا سوپ میں ریت کی شکایت کرنے؟'' نوجوان نے جواب دیا ''سر ہم ملک کی خدمت کرنے کے لئے آئے ہیں، اسے کھانے کے لئے نہیں۔''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

کوئی نہ تھا۔ ہاں، ہمارے تین ملازم انٹلکچوئل نوجوان اوپر کافی روم میں بیٹھے فرائڈ، جیمز جوائس وغیرہ پر بحث کر رہے تھے۔ دو بیرے اوپر کافی روم میں تھے، تیسرا غالباً نیچے باورچی خانے میں سو رہا تھا۔

مجھے بازار سے دو آدمی کافی ہاؤس کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے پہلے سمجھا کہ آخر کچھ گاہک آئے، لیکن ان کے بشرے اور حلیے کافی پینے والوں سے مختلف تھے، اور ان میں سے ایک تو وہی باریک مونچھوں اور کیل دار بوٹوں والا باقر کا بھانجا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کے روبرو اندھیرا سا چھانے لگا۔ دوسرا ایک خشخشی ڈاڑھی والا خشمگیں قسم کا آدمی تھا، جو اپنے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا کینوس کا بیگ پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے میں ایک لوٹا۔ وہ بظاہر سیدھا ریلوے اسٹیشن سے آ رہا تھا۔ ان کے پیچھے ایک موٹی برقع پوش خاتون بھی تھی جو ایک سات سالہ ناخوشگوار لڑکے کا بازو پکڑے ہوئے تھی، جیسے اسے روک رہی ہو۔ مجھے یہ قیاس لگانے میں دیر نہ لگی کہ خشخشی ڈاڑھی والا شخص باقر قبضہ اسٹور کا پروپرائٹر محمد باقر ہے اور برقع پوش خاتون اس کی زوجۂ حیات اور ناخوشگوار منھ والا بچہ یقیناً اس مبارک جوڑے کا لاڈلا بیٹا تھا اور اس کے اہل و عیال نے اسٹیشن سے اترتے ہی اس طرف کا رخ کیا تھا۔

خطرے کو پا کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر بھاگ کر چچا عبدالباقی کے آفس میں پناہ کا طالب ہوں کہ وہ سب (عبدالغفور لانڈری ورکس کا پروپرائٹر اب آستین چڑھائے ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا) ڈبل فائل میں طوفانی حملے کی نیت سے دکان کی طرف بڑھنے لگے۔ ہراول میں محمد باقر، اس کا بھانجا اور عبدالغفور تھے۔ ان کے پیچھے برقع پوش خاتون اور وہ کمینہ فطرت لونڈا تھا۔ وہ ایک جرمن ٹینک دستے کی طرح بڑھ رہے تھے اور ان کا ارادہ دکان کو ایک برق آسا پہلے حملے میں فتح کرنے کا تھا۔

بھاگنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے جلدی سے ایک بیرے کے ہاتھ اوپر آفس میں چچا عبدالباقی کو ''ایس او ایس'' بھی بھیجا تھا۔ ابھی ''ایس او ایس'' بھیج کر فارغ ہی ہوا تھا کہ مجھے اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوا، میری آنکھوں کے سامنے اشیا کچھ دھندلی دھندلی ہو رہی تھیں۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے میری آنکھوں کا فوکس خراب ہو گیا ہے۔ ان کو فوکس کرنے کے بعد میں نے اپنے سامنے باقر کے بھانجے کو کھڑا دیکھا۔ اس کا ہاتھ میری نکٹائی پر تھا اور وہ اسے غصے میں کھینچ رہا تھا۔

''سنا بے نوابزادے!'' وہ کہہ رہا تھا ''باہر نکل یہاں سے۔۔۔کہاں ہے وہ تیرا گولہ سا مینیجنگ ڈائریکٹر؟ چار سو بیس۔''

میں نے کہنے کی کچھ کوشش کی، مگر گلے کے گھٹنے کی وجہ سے میری آواز غرغراہٹ بن کر رہ گئی۔ میرے ارد گرد ایک محشر کا سا ہنگامہ بپا تھا۔ لانڈری ورکس والا عبدالغفور بیروں کو دھکے مار مار کر باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقر اپنے لوٹے کو دھمکانے کے انداز میں اپنے اوپر گھما رہا تھا۔ برقع پوش خاتون چمچے سے مسلح اِدھر اُدھر ایک غصیلے شیر ببر کی طرح دندنا رہی تھی۔ باقر کا لونڈا باورچی خانے میں گھسا ہوا اپنی جیبوں کو کیکوں اور کیشونٹوں سے ٹھونس رہا تھا۔ ان واقعات کی پوری تفصیل دینا ممکن نہیں۔ دو تین کرسیاں ہوا میں اڑتی ہوئی میرے پاس سے سفر کر کے بازار میں جا گریں، ظاہراً مجھ پر نشانہ کیا گیا تھا۔

پھر چچا عبدالباقی کی آواز آئی۔ وہ اوپر سے اتر آیا تھا——وقار اور سرد حوصلے کی پوری تصویر۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' اس نے حاکمانہ لہجے میں پوچھا ''بختیار، پولیس کو فون کرو!''

میں اس حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر تھا، کیونکہ اوّل تو فون ہی نہ تھا، اور ہوتا بھی تو اپنی اس موجودہ حالت میں، جبکہ باقر کے بھانجے نے ابھی میری نکٹائی کو نہ چھوڑا تھا، یہ قطعی ناممکن تھا۔

چچا عبدالباقی نے اب باقر کو پہچانا۔

''بھئی باقر، بات تو سنو، مجھے سمجھا تو لینے دو۔ یوں دکان کے مال کا نقصان نہ کرو۔''

برقع پوش خاتون چچا عبدالباقی کو بے ایمان اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے لگی۔ اس نے اپنے چمچے کو ایک غضبناک انداز میں چچا کے سر پر لہرایا۔ باقر نے چچا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا، جیسے کہ

اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ باقر کا بھانجا آخر میری ٹائی چھوڑ کر چچا کی طرف لپکا۔

محمد باقر نے کہا ''عبدالباقی، تم تو سخت بے ایمان ہو۔ اچھا میں تمھیں دکان سونپ گیا تھا! کہاں ہیں میرے قبضے اور کیل، ڈھائی تین ہزار کا مال؟''

چچا عبدالباقی نے اسے سمجھانے اور اس کے غصے کو دھیما کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے یہ بھی خوشخبری دی کہ اس کا کافی ہاؤس میں ایک تہائی کا حصہ ہے، جس پر محمد باقر نے کہا'' کافی ہاؤس کی ایسی تیسی!''

اس نے کافی ہاؤس اور ہمارے متعلق اور بھی ایسے کلمات کہے جنھیں چھاپا نہیں جاسکتا۔

''اچھا، میرا ڈھائی تین ہزار کا مال کہاں ہے؟'' محمد باقر نے پوچھا۔ چچا عبدالباقی نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے اور اپنے چشموں میں سے خوش طبعی کو منتشر کرتے ہوئے کہا'' فروخت ہوگیا۔''

''فروخت ہوگیا؟ سارا مال؟'' محمد باقر گرجا۔

چچا نے میری طرف اشارہ کیا'' میاں بختیار نے تمھارا مال چند ہی دن ہوئے فروخت کر دیا۔ اس کی ہمت ہے۔ تمھاری دکان میں تو یہ ایک سال سے پڑا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ فروخت پر دس فیصد کمیشن چارج کریں گے۔ اگر تمھاری مرضی نہ ہوئی تو نہیں کریں گے۔ بھئی بختیار، محمد باقر کے مال کے پینتالیس روپے آٹھ آنے ان کے حوالے کردو۔''

''پینتالیس روپے آٹھ آنے!'' باقر چلّایا'' میرا ڈھائی ہزار کا مال۔'' اس نے میری طرف دیکھا ''بچو! میں تمھارے فرشتوں سے بھی تین ہزار وصول کروں گا۔ بھانجے، ذرا اس پینتالیس روپے میں میرا مال بیچنے والے کو ٹائی سے کھینچ کر باہر تو نکال۔ ذرا اس کی شکل تو اچھی طرح دیکھیں۔''

چچا عبدالباقی اور میر باقر کے بھانجے اور عبدالغفور کے ہاتھوں جو درگت بنی اور جو غیر شائستہ سلوک ہمارے ساتھ کیا گیا، اس کا ذکر یہاں کرنا میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ چچا کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹا۔ میرے اپنے دو دانت شہید ہوئے۔ ہم دونوں کو اوپر آفس میں چار گھنٹے محبوس رکھا گیا۔ بڑی مشکل سے ایک اقرارنامے پر دستخط کرنے کے بعد، کہ ہم محمد باقر کو اس کی دکان پر ناجائز قبضہ کرنے کے عوض ہرجانے کے طور پر ڈیڑھ ہزار روپیہ دیں گے اور یہاں سے اپنی کوئی چیز (از قسم فرنیچر) نہیں لے جائیں گے، ہماری جان چھوٹی۔ ہم نے کافی ہاؤس کو خیر باد کہا۔

باقر نے اپنی اس رقم کی پائی پائی وصول کی اور میرا والد، جس کو یہ رقم ادا کرنی پڑی، اس کے بعد عرصے تک مجھ سے ناراض رہا۔

اگلے روز جب میں چچا عبدالباقی سے ملنے گیا تو اس کی عینک میں نیا شیشہ تھا۔

''بیٹھو بختیار، میں تم سے ایک ضروری معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس دفعہ تو ہمارا کاروبار چل پڑا تھا۔ گلہری نے بھی حکومت سے ہماری سفارش کر دی تھی۔ گاہک بھی ایک دو دن میں آنے لگتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم صحیح خطوط پر کام کر رہے تھے۔ محمد باقر نے اپنے نامعقول رویے سے ہمیں سخت نقصان پہنچایا۔ خیر، اس کو چھوڑو، میں تم سے پھر ایک ضروری معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔''

محمد خالد اختر ۲۳ر جنوری ۱۹۲۰ء کو اللہ آباد ضلع بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے الیکٹرونک انجینئر تھے۔ لکھنے کا آغاز اُنہوں نے اوائل عمری ہی سے کر دیا تھا۔ اُنھوں نے نثر کے بیشتر میدانوں میں طبع آزمائی کی اور اپنا لوہا منوایا۔ ناول نگاری، افسانہ نگاری، سفر نگاری، مزاح نگاری، سوانح نگاری سب پر طبع آزمائی کی اور خاصی کامیابی سے کی۔ اُن کا مزاح خاصا شستہ اور جاندار ہے۔ وہ مشہور مزاحیہ کردار چچا عبدالباقی کے کردار کے خالق تھے، اس ضمن میں اُنھوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن کی تصانیف میں بیس سو گیارہ (ناول)، چاکیوڑہ میں وصال (ناول)، کھویا ہوا افق (افسانے)، چچا عبدالباقی (مزاحیہ افسانے)، یاترا (سفرنامہ)، ابنِ جبیر کا سفر (سفرنامہ)، دو سفر (سفرنامے) وغیرہ شامل ہیں۔ ۲ر فروری ۲۰۰۲ء کو کراچی میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

سیّد عارف مصطفیٰ

بے بسی کا سفر

کسی بھی بشر کے دو سفر عجب لاچاری کے ہوتے ہیں۔ سب کچھ دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور بس ہوئے چلا جاتا ہے۔

ایک وہ سفر جب بندہ بحالت لاش میت کے گھوارے میں ہو اور دوسرا جب بندہ بصورت دُلہا، عروسی سواری میں ہو۔

اس بے بس سفر کا اختتام بھی تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ سارے حاضرین منہ دیکھ دیکھ کر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ تھوڑا سا فرق منزل اور منزل کی جانب سفر میں ضرور ہے۔ پہلا والا سفر بالجبر ہے اور دوسرا سفر بالرضا ہے لیکن اکثر صورتوں میں آغاز بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی۔

کچھ عادی متعفن کیسز میں تو دونوں طرح کے لاچار مسافروں کے لئے یہ نغمہ بھی قدر مشترک ہے ع

آج ہی ہم نے بدلے ہیں کپڑے آج ہی ہم نہائے ہوئے ہیں

دلہاؤں کی اس تاریخی بیکسی پہ نفرین بھیجتے ہوئے ہم نے نوعمری ہی میں گویا طے کرلیا تھا کہ اگر ہم بھی کبھی مبتلائے شادی ہوئے تو خود کو یوں بے بس ہو کر تماشا نا بننے دیں گے بلکہ ہشیاری چوکسی و مستعدی کی ایسی تابندہ مثال قائم کریں گے کہ اس کی روشنی میں عرصۂ دراز تک حواس باختہ دلہاؤں کو لعنت ملامت کی جاسکے گی اور غفلت شعار نوشے ہماری مثال سے اپنی ازدواجی عاقبت سنوار سکیں گے لیکن استغفراللہ۔۔۔ اس کا مطلب لیکن یہ بھی ہرگز نہ لیا جائے کہ ہم اپنا جوتا چوری نہ ہونے دینے اور اس کے بجائے خود کسی اور کا جوتا چرا کر سب کو حیران کردینے کا سوچ رہے تھے۔

ہمارے ''چوکسی پروجیکٹ'' کا آغاز تو قبل از شادی کی رسومات سے ہی ہوگیا تھا کیونکہ ہم نے صاف اعلان کردیا تھا کہ فضول رسومات نہیں کی جائیں گی لیکن جب سنی ان سنی کرتے ہوئے اُن کا آغاز کردیا گیا اور یکا یک اعلان ہوا کہ ایک رسم کو ادا کرنے کے لئے سات سہاگنیں آگے آجائیں تو پھر ہم نے موقع غنیمت جان کر اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا، اس طرح کی دلآزار رسم کی سخت مذمت کی اور کہا کہ سات سہاگنیں نہیں بلکہ کوئی بھی بیوہ خاتون یہ رسم کروائیں تو پھر آناً فاناً باقی رسومات کو ہی لپیٹ دیا گیا اور موقع پہ موجود بھی خواتین ان رسومات کو برملا واہیات اور فضول قرار دینے میں ہم سے زیادہ مستعد ہوگئیں اور یہ سارا بکھیڑا دفعتاً سمیٹ لیا گیا۔

''میاں بارات ٹھیک نو بجے لے آنا!'' تنبیہی انداز میں یہ بات ہمارے ماموں نے ہم سے دو ماہ پہلے ہی کردی تھی جو کہ ہماری بھانجہ گیری کے بعد اب ہماری دامادگردی سے دوچار ہونے

والے تھے، ہماری شادی ہماری ماموں زاد سے ہوئی ہے۔۔۔ انہی سے ہوسکتی تھی کہ کسی اور میں ہم ایسے آئیٹم بھگتانے کا یارا نہ ہوسکتا تھا لیکن ہمارے ماموں جان یعنی سسر محترم بھی بہت خاصے کی چیز تھے، اُن کو بھگتنے کا کس بل بھی ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بہت مستقل مزاج تھے اور کسی سے بھی اپنا کوئی بھی کام مسلسل تعاقب اور موسلا دھار یاد دہانی کے بل پہ کرالینے کا بہت خاص وصف رکھتے تھے۔۔۔ خصوصاً یاددہانی کی ضمن میں اپنے پیغام کا مضمون ہر بار ایک نئے ڈھنگ سے باندھتے تھے۔ میر انیس نے تو منظر نگاری پہ اپنی قدرت کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ

اک پھول کا مضمون ہوتو سو رنگ سے باندھوں

اُن کی ملاقات اگر ہمارے ماموں سے ہوسکتی تو وہ بالیقین ان کی شاگردی کے بوریئے پہ بیٹھ رہتے۔ مختصری بات کو پھیلانے میں ایسا یدطولیٰ پایا تھا کہ محض ایک ہی تل سے سیر بھر حلوہ بنانے پہ قادر تھے، تاہم نرم دل تھے کسی کے چہرے پہ تکلیف کی رمق بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے مخاطب کو طول کلام کی وادی میں اتارتے ہی اُس کی جانب سے آنکھیں موند لیتے تھے۔

کچھ تو ان کی اِس تابڑتوڑ پیچھے لگنے کی عادت اور ڈسپلن پسندی کے سبب اور کچھ ہمارے اپنے، ماضی کے دعوؤں اور پابندیٔ وقت کے عزائم کی رو سے بھی لازمی تھا کہ ہم بارات حسب اعلان ٹائمنگ پہ لے آئیں، اسی لیئے سارے رشتہ داروں اور احباب کو پہلے سے ہی کئی کئی بار خبردار کردیا تھا کہ سارا کام کارڈ پہ درج ٹائمنگ کے عین مطابق ہوگا، اسی سبب ایک ایسی جنگی صورتحال ابھر آئی کہ کہ ہم بارات لے کر شادی کارڈ کے مطابق ٹھیک ۹ بجے ہال جا پہنچے تھے جبکہ اس وقت آس پاس کے ہالوں میں صرف الو، انتظامیہ اور ابا جان قسم کے لوگ ہی بول رہے تھے۔

یہاں پھر سسر مرحوم کا تذکرہ لازمی ہے۔۔۔ کچھ لوگ فوج میں نہ جاسکنے کا بدلہ معاشرے سے گھر میں ہی بچوں کی فوج بنا کر لیتے ہیں۔ سسر مرحوم کی بابت یہ معاملہ تھا یا نہیں، تاہم گھر میں اولاد کی ریل پیل اور نظم وضبط کی سخت پابندی اسی جانب اشارہ کرتی تھی۔ اس میں بھی نظم سے زیادہ توجہ ضبط پہ ہوا کرتی تھی، اس لحاظ سے اُن کی صحیح جگہ اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ یا کوسٹ گارڈ وغیرہ وغیرہ میں بنتی تھی۔ مرحوم نے ڈسپلن کے ایسے آہنی اصول اپنے گھر کی

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ء ۔ ۱۸۹۷ء) نے ایک بار بتایا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں وائس چانسلر بن کر آئے تو یونیورسٹی کے کچھ لوگ اُن سے ملے اور کہا کہ یونیورسٹی میں کئی اسٹاف ممبر رجعت پسند اور فرقہ پرست ہیں، ان کی وجہ سے یونیورسٹی برباد اور تباہ ہو رہی ہے۔ اگر ان سب لوگوں کو نکال دیا جائے تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل درست ہوجائے گی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ آپ لوگ ایسے لوگوں کی فہرست بنا کر مجھے دیجئے۔

پھر کچھ دوسرے لوگ ذاکر صاحب سے ملے۔ اُنہوں نے بھی کہا کہ یونیورسٹی کے کئی اُستاد کیمونسٹ اور دہریئے ہیں۔ ان کو یہاں سے نکال دیں تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل صحیح ہوجائے گی۔ ذاکر صاحب نے ان سے بھی کہا کہ آپ مذکورہ افراد کی فہرست بنا کر مجھے دے دیں۔

دونوں اطراف کے صاحبان کی طرف سے فہرستیں بن کر آگئیں۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سو آدمیوں کا تدریسی عملہ تھا جبکہ دونوں فہرستوں میں دو دو سو نام درج تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا ''میں حیران ہوں کہ آخر تین سو آدمیوں میں سے چار سو آدمیوں کو کیسے نکال دوں؟''

دونوں فہرستوں کو ملا کر جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس نام ایسے ہیں جو دونوں فہرستوں میں مشترکہ طور پر موجود ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ بتایئے، اگر میں ان سب کو نکال دوں تو پھر یونیورسٹی میں کون رہ جائے گا جو یہاں بچوں کو پڑھائے گا''

الجمعیۃ، دہلی۔ ۲۸/جون ۱۹۸۰ء

حدود میں نافذ کردیئے تھے کہ کسی بھی فوج میں ایسے اُصول متعارف ہوتے تو یقیناً بیشتر فوجی آغاز ہی میں خوشی خوشی کورٹ مارشل کرالیتے۔ اس سب کچھ انضباطی ماحول کی تخلیق کے باوجود زیادہ تر نہایت نامطمئن رہا کرتے تھے، شاید اس لیئے کہ سارے علوم پریشانیات گھول کے پی رکھے تھے۔ موصوف ہمہ وقت تنقید کی بندوق لیئے پھرتے تھے اور ہر آسان ہدف پہ نشانہ باندھ لیا کرتے تھے اور اُن دِنوں ہم سالم نشانے پہ تھے۔ نکاح سے ایک ماہ پہلے ہی ہم سے بطور فرمائش مگر باطریق فہمائش یہ بھی بتا دیا تھا کہ ''قائدے کی رو سے نکاح کے لئے قاضی تم لاؤ گے۔''

اِس پر ہم نے احتیاطاً ایک نہیں دو پلے پلائے نکاح خوانوں کو دھر دبوچا، جن میں سے ایک کا رول متبادل یا اسٹپنی کا تھا کہ اگر پہلا وقوعہ پہ بروقت نہ پہنچ سکے تو بھی عزت رہ جائے، لیکن ناگہانی یہ ہوئی کہ ہماری تاریخی لاپرواہیوں کی شہرت سے خائف ہو کر ماموں جان خود بھی ایک دائی سے بوسیدہ سے قاضی کو اُچک لائے اور ہال میں ہمارے دونوں اور اُن کا لایا ہوا ایک قاضی جب آمنے سامنے ہوئے تو اسی وقت ریکٹر اسکیل پہ ایک چھوٹا سا زلزلہ ریکارڈ کیا گیا۔ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر نظروں نظروں ہی میں غرا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اپنے قاضیوں کو اپنے خاندان اور احباب کی متوقع کئی شادیوں کی زرخیز خبریں بہم پہنچائیں، انہیں بلانے کی خوشخبری سے شادکام کیا اور بنا کام ہی پورا معاوضہ دے کر رخصت کیا۔

اِس سے قبل، بلاشبہ شادی ہال میں ہم نہایت کشاں کشاں پہنچے تھے اور لاریب ہمارے اوسان بجا تھے اور حواس خمسہ حد درجہ چوکس، کیونکہ گھر سے ہی نہایت چاق و چوبند رہنے اور ہوشیار نظر آنے کا عزم کر کے نکلے تھے جس کا سبب یہ تھا کہ ہم ہمیشہ دلہاؤں کی بدحواسی کا پھلکا اُڑاتے رہے تھے کہ اپنی شادی کے مواقع پہ کیا انجینیئر کیا ڈاکٹر اور کیا پلمبر و میکنک، سبھی ٹائپ کے دلہے یکساں سائز کے چغد بنے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ہم اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ کسی بھی شادی کے تمبو میں آپ کو صرف دو افراد نہایت بدحواس دکھائی دیں گے، ان میں سے ایک وہ جس کی پتلون کی زپ یکا یک ٹوٹ گئی ہو اور دوسرا؟ اور دوسرا بلاشبہ دولہا ہی ہوگا! لیکن اب چونکہ ہمارے حواسوں کی آزمائش کا وقت آن پہنچا تھا چنانچہ ہم نے بوقت نکاح، اپنے حواس کی بیداری کا برملا مظاہرہ ایک شوخی کی صورت اس وقت کیا کہ جب قاضی نے ''قبول، قبول، قبول'' کے تقاضے کی تکرار باندھی اور یہاں ہمارے پاس ''ایک چپ تھی سب کے جواب میں۔'' قاضی اور حاضرین کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس کے علاوہ کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ پھٹنے والی چیزوں میں زیادہ تر آنکھیں ہی آسانی سے مشاہدے کی گرفت میں آسکتی ہیں۔ دلہن کے والد جو ہمارے ماموں بھی تھے حسب موقع طرا گئے اور اس

انہونی پہ غش کھا کر گرنے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈنے لگے لیکن اسٹیج پہ جگہ بہت کم تھی اور ایسی رسومات کے لئے تو انتہائی ناکافی، ماحول میں یکا یک سناٹا سا گونج گیا" ذرا آزادی کے ان چن آخری لمحات کو تو اورا نجوائے کرنے دیجیئے ناں قاضی جی!"

ہمارے لبوں سے جیسے ہی یہ فقرہ نکلا، فضا میں ایک باجماعت سکون کی سانس سنائی دی اور ہمیں بہت ہی ناز بردارانہ احتیاط سے کنیوں نے گھر کا" اس موقع پہ بھی تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے۔۔۔!!"

بعد کی رسومات میں بھی ہماری شوخیٔ طبع اپنے عروج پہ رہی اور بہتوں کو ہم دلہا سے زیادہ شہ بالا دکائی دیئے، جبکہ دستور "شہ باؤلا" نظر آنے کا تھا مگر ہم نے تو کھانا شروع ہونے پر ایک ایک دوست کو اس کی نشست پہ جا جا کر پوچھا۔ چونکہ کسی بھی بشر کی زندگی میں سب سے زیادہ عزت اور ناز برداری کا دن شادی کا ہوا کرتا ہے اور ایسے ایسوں کو بھی ہاتوں ہاتھ لیا جاتا ہے کہ جو عام حالات میں لاتوں لات کے ہی قابل گردانے گئے ہوتے ہیں، سو ہم نے بھی جوابی حملے نہ ہونے کا یقین کر کے، ڈھیروں جگت بازیاں بھی کیں اور مجبور متاثرین کے بے بس قہقہوں کو خوب انجوائے کیا۔

لیجیئے۔۔۔آن کی آن رخصتی کا وقت آن پہنچا اور اب تک کوئی گڑبڑ نا ہوئی تھی۔ ہماری خود اعتمادی کا گراف اطمینان بخش لیول پہ پہنچا ہوا تھا۔ دلہن صاحبہ غرارہ سنبھالے کچھ اِس آہستگی سے سیڑھیاں اُتر رہی تھیں گویا بیٹری سے چلنے والی گڑیا کا چارج ختم ہو رہا ہو۔ فتحمندی کے سرشار احساس کے ساتھ ہم ہر سمت پھبتیاں اچھالتے اپنی عروسی گاڑی میں آبیٹھے جو پھولوں اور کلیوں سے یوں بجی تھی کہ کسی گورے کی میت والی خاص وین معلوم ہو رہی تھی۔

گولا گنڈا سی سجاوٹ والی اس گاڑی کا واپسی کا سفر گیارہ بجے شروع ہوا۔ کار ہمارا پھوپھی زاد عبدالحفیظ چلا رہا تھا، ذرا ٹک کر بیٹھے تو تھکان اور ہیجان نے بے جان کر دیا اور دماغ کچھ دیر کے لئے ماؤف سا ہو گیا۔ ہوش اُس وقت آیا کہ جب یکا یک کار رُکی۔ آناً فاناً اترے تو خود کو مزارِ قائد کے سائڈ کے پھاٹک پہ کھڑا پایا۔

"ہائیں ہائیں۔۔۔یہ کیا ہے حفیظ۔۔۔؟" ایک دلدوز چیخ جیسی آواز ہمارے گلے سے نکلی جو ہمیں بھی اپنی نہ لگی۔

"کیا مزارِ قائد کو نہیں پہچانتے آپ۔۔۔سلامی دیجیئے اس عظیم عمارت کو؟" عبدالحفیظ نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

"بھئی یہ سب کیا ہے۔۔۔ نارتھ ناظم آباد سے گلشن اقبال جاتے ہوئے یہ مزارِ قائد راستے میں بھلا کہاں پڑتا ہے؟"

اس اُلٹے بانس بریلی والی حرکت کے ارتکاب پہ اس ستمگر نے نہایت کٹیلے انداز میں کہا" ارے بھائی یہ دراصل میں آپ کو سزا دے رہا ہوں، ہر کام میں ٹائم اور شیڈول کا پہاڑا پڑھنے کی سزا۔۔۔غضب خدا کا، ابھی وہاں آس پاس کے کسی ہال میں کوئی بارات اُتری بھی نہیں تھی اور یہاں آپ شتابی سے رخصتی بھی کرا چکے۔"

کافی دیر یونہی چھیڑ چھاڑ لگی رہی اور پھر بہت تنگ کرنے کے بعد ہمیں لا دکے عروسی کار پھر منزل کی جانب چل پڑی۔

واپسی کے اس سفر میں ہم نے دل ہی دل میں کم از کم یہ تو مان لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو، شادی والے دن کسی بھی طرح کے دُلہا کی باگیں اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں رہتیں۔۔۔ بعد میں ثابت ہوا۔۔۔کہ شادی کے دن کے بعد تو بالکل بھی نہیں رہتیں۔۔۔!!

سیّد عارف مصطفٰی کا تعلق کراچی سے ہے۔موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک دردِ دل رکھنے والے بلاگر ہیں۔خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں اِن کی مساعی جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں بھی اِن کا خاصا ہاتھ ہے، کراچی جیسے آلام زدہ شہر میں فکاہی مجالس برپا کرنا انہیں کا کام ہے۔ارمغانِ ابتسام کے لئے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

مراد علی شاہد

ہم پاکستانی

پاکستان دنیا کی واحد ریاست ہے جسے مذہب اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا مگر ہم پاکستانیوں نے اپنے بچوں کے نام عبدالسلام اور اطلاق اسلام کے لئے ،اسلام زندہ باد کے نعرے لگا لگا کے ریاست کا یہ احسان بھی اُتار دیا ہے۔

بالکل ایسے ہی جیسے کسی محفل میں ایک ملی نغمہ ''اے قائد اعظم تیرا احسان ہے احسان'' چل رہا تھا کہ ایسے میں ایک نشئی لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور کہنے لگا کہ ''بند کرو یہ احسان وحسان ہم نے آدھا احسان ۱۹۷۱ء میں اُتار دیا تھا باقی بھی اتارنے کی کوشش کریں گے۔''

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر کلومیٹر پر درگاہ اور دربار ہے، جس کی اہم پیداوار ''ملنگ'' ہیں اور یہ ملنگ مرشد کے ایسے مرید ہوتے ہیں جو لنگر کھالیں تو شکم سیری کی بنا پر مستی میں ہوتے ہیں اور نہ کھائیں تو بھوک کی وجہ سے مست ہو جاتے ہیں۔اور اگر کوئی مرید بٹ صاحب ہو تو سونے پہ سہاگہ ہو جاتا ہے۔جیسے کہ ایک بٹ صاحب اپنے مرشد سے ملنے گئے ،لنگر خانہ میں جب دس پلیٹ چاول تناول فرما چکے تو تو مرشد کا ایک مرید آیا اور کہنے لگا کہ ''بٹ صاحب تسی مرشد نوں منویا نا منو،مرشد ہوری تہانوں من گئے نیں''۔

اگر اِرد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات آپ پر بھی واضح ہو جائے گی کہ پاکستان میں ''ملنگ، پولیس اور پیر'' کا فرر روز گار خدا نے اس جاہل قوم پہ چھوڑ رکھا ہے، کہ یہ تینوں طبقہ ہائے بے فکر تقریبا ہر کلومیٹر پر آپ کی توجہ کے منتظر پائے جائیں گے۔مذکور طبقہ ہائے بے فکر کہیں بھی آپ کو مل جائیں تو یہ خود ہی آپ سے ایسے میل ملاپ بڑھا لیتے ہیں کہ پھر آپ کسی سے ملنے کے قابل نہیں رہتے۔

انگریز کو جب بھی بھوک لگتی ہے برگر یا سینڈوچ کھا لیتے ہیں اور یہی ان کا کھانا بھی ہوتا ہے، پاکستانی تین برگر اور دو پیپسی اور ایک لمبا ڈکار مارنے کے بعد کہہ رہا ہوتا ہے کہ ''اوئے بس یار گھر جا کے روٹی وی کھانی اے''۔ پیزا اور لزانیہ کے بارے میں پوری دنیا کی سکہ بند رائے ہے کہ اٹلی اور فرانس میں یہ پراٹھے کے نعم البدل ہیں ،یعنی دونوں میں سے کسی ایک پر ہی ہاتھ صاف کیا جاتا ہے جبکہ ہم پاکستانی پراٹھے کے نعم البدل ہونے کی بنا پر اسی تناسب سے پیزا اور لزانیہ کھاتے ہیں جس حساب سے پراٹھوں کو رگڑا دیتے ہیں۔

ہم پاکستانی شادی، افطاری اور زبردستی کی دعوت کھا کے ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوتے ہیں کہ ''اوئے یار اج بڑا مزہ آیا کھانا کھانے کا۔''

پاکستانی پرائی شادی پہ اس وقت تک کھاتے رہتے ہیں جب

ایک صاحب نے اپنے مکان کا پتہ یہ بتایا ''فیرُز روڈ پر جس جگہ یہ بورڈ لگا ہے کہ یہاں ہارن بجانا منع ہے، اُس کے سامنے ڈامر سے لکھا ہے'' مرغ دل مت رو یہاں ہارن بجانا ہے منع''، اُس دیوار کے قریب ہی رزّاق مٹھائی والے کی دکان ہے۔ اِس دکان سے بائیں جانب مڑ کر ''ساجن کیوں نہ آئے'' جہاں لکھا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مُڑ جایئے، اس سے آگے ''سیّاں باورے'' لکھا ہوا ملے گا، اس سے دائیں جانب مڑیئے۔۔۔بس سامنے ہی ہمارا مکان ہے جس کی دیوار پر ڈامر سے یہ لکھا ہے کہ ''میرا بلبل سو رہا ہے، اِسے نہ جگانا۔''

بات سے بات از نصر اللہ خان

تک گھر والوں کی طبیعت خراب نہ ہو جائے یا پھر اس وقت تک جب تک اپنی طبیعت ناساز نہ ہو جائے۔ اسی لئے روائت مشہور ہے کہ اگر امریکہ میں کسی ہوٹل سے چار لوگ کھانا کھا کے نکل رہے ہوں تو سب کے سب ہنستے مسکراتے ہوئے آ رہے ہوتے ہیں، کیونکہ امریکن سسٹم کے تحت سب نے اپنا حصہ ڈالا ہوتا ہے جبکہ ایسے ہی چار افراد اگر پاکستان کے کسی ہوٹل سے نکل رہے ہوں، تین لوگ ایک پہ ہنس رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ پاکستانی سسٹم کے مطابق کسی ایک کی شامت آئی ہوتی ہے۔

چغلی ہمارا قومی کھیل اور طعنہ زنی قومی شعار بن چکا ہے یقین نہ آئے تو شام سات سے دس بجے تک کسی بھی نیوز چینل پر ٹاک شوز میں سیاستدانوں کی ''مغلظانہ'' گفتگو سماعت فرمایئے، اگر آپ شادی شدہ مرد ہیں تو بیویوں کی جلی کٹی اور شادی شدہ عورت ہیں تو ساس کے طعنے، معنے ان سیاستدانوں کے مقابلے میں پھیکے محسوس کریں گے۔

ہمارے ہاں معیشت، جمہوریت اور بہو ہمیشہ ہی خطرے میں ہوتے ہیں۔ اگر مذکور تینوں خطرے سے باہر ہوں تو پھر ملک، سیاستدان اور ساس خطرے کے گھیرے میں دھر لئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے آگ اور پانی ایک ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟ خیر اس سائنسی دور میں یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے، اگر یہ اندازہ ہو جائے کہ آگ کون ہے؟

ہم اہل پاکستان سگریٹ، رشتہ اور قرض مانگنے میں رتی بھر بھی شرم محسوس نہیں کرتے، رشتہ ایسے مانگ لیتے ہیں جیسے کسی دوست سے سگریٹ اور سگریٹ ایسے جیسے قرض۔ کیونکہ سگریٹ، قرض اور ادھار لے کر کوئی واپس نہیں کرتا۔ گویا سگریٹ کا دھواں کسی کا نہ ہوا، وہ ادھار ہی کیا جو ادا ہو گیا اور وہ رشتہ ہی کیا جو وفا دے گیا۔

موسم سرما میں کینو اور مونگ پھلی کے چھلکے شرطیں باندھ کر دور دور پھینکنا ہمارے قومی فرائض میں شامل ہے تاہم چلغوزے کے چھلکے ہم زیورات کی پوٹلیوں میں چھپا کر رکھتے ہیں مبادا چھلکوں کے اندر پھر سے چلغوزے جنم پذیر ہو جائیں۔

بیرونِ ملک سے وصول کردہ پیسوں کو ایسے خرچ کرتے ہیں جیسے بندر ہتھ بندوق آ جائے تو بلا مقصد فائر کھولتا رہتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بندر کے ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے اور۔۔۔

الغرض پاکستانی ملک میں ہوں یا دیارِ غیر میں اپنی ''حرکتوں اور عادتوں'' سے اپنا لوہا منوا ہی لیتے ہیں۔ ہم پاکستانی اپنی رائے کا اظہار نشہ اور غصے میں کرتے ہیں، اسی لئے ہماری آدھی قوم نشہ میں اور باقی غصے میں نظر آتی ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی بھی غریب راہگیر کی بیوی اور امیر کی گاڑی کو چھیڑ کر دیکھ لیجئے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

مرادعلی شاہدؔ صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر ''شعبۂ پاکستان اسٹڈیز'' فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور نثر نگاری میں صرف اور صرف طنز و مزاح ہے۔ ''قندِ شیریں'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں جو ایک موقر اخبار میں تواتر سے شائع ہو رہا ہے۔ مراد صاحب فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

زونیرا علی

گھریلو ایسٹ انڈیا کمپنی

میرے ایک چچا میاں ہیں، جن کی یکے بعد دیگرے تین شادیاں ہوئیں ہیں اور تینوں کی تینوں ناکام۔۔۔(ناکامی کی وجوہات کسی نیوز چینل سے نشر نہیں ہوئیں، نہ ہی چچا میاں نے کوئی واضح بیان جاری کیا ہے) اب وہ شدید طور پر مجرد تھے اور چوتھی شادی کے لیے گھر والوں پہ دباؤ ڈال رہے تھے مگر گھر والے مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے کیونکہ اُن کی بار بار فلاپ ہو جانے والی شادیوں کی وجہ سے انہیں خاصی سیر حاصل باتیں سننا پڑی تھیں اور وہ مزید کے متحمل نہیں لگ رہے تھے۔ آخر چچا میاں کی مسلسل ''آہ نیم شبی و دن دیہاڑی'' کام آئیں۔ خاندان کی واحد ''ویٹو پاور'' دادی جان نے تمام گھر والوں کی خوب خوب خبر لی اور اُن کی جدوجہد کا رُخ از سرِ نو ایک عدد نئی چچی ڈھونڈنے کی مہم کی طرف موڑ دیا مگر اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا اور صورتحال خاصی گھمبیر ہو چکی تھی کیونکہ کم از کم خاندان میں تو اِس ضمن میں کوئی بھی بات کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہر کوئی دبے دبے لفظوں اور اُٹھی اُٹھی آواز کے ساتھ مسلسل انکاری تھا اور اپنی لڑکی کو جیتے جی سولی پر چڑھانے سے یکسر منحرف تھے۔ نتیجتاً ہر بار متذکرہ مہم سے واپسی پہ دادی جان کا پارہ خاصا ہائی ہوتا اور وہ دیگر صلواتوں کے سرگم میں چاچو کو یہ جتلانا نہ بھولتیں کہ یہ اُن کی قطعاً آخری شادی ہو گی۔

ویسے ہمارے خیال میں تو یہ اُن کی از روئے قانون و مذہب بھی آخری شادی ہی تھی کیونکہ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد کو صرف چار شادیوں کی اجازت ہے اور یہ چونکہ اُن کی چوتھی شادی تھی اس لیے ہمارے خیال میں اُن کے پاس اب لاسٹ چانس تھا۔ اگر اب کی بار بھی چچا میاں کے بقول قسمت خراب نکلی (اب پتا نہیں کہ یہ قسمت کی خرابی چچا میاں کی تھی یا ممکنہ چچی کی) تو کم از کم اس زندگی میں تو وہ مزید شادی نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ہمیں اس ضمن میں اُن سے پوری پوری ہمدردی تھی۔

ہم نے اپنی پریشانی کا اظہار آپی سے کیا ''آپی مرد کو پوری زندگی میں صرف چار شادیوں کی اجازت ہے، اگر چاچو کی چوتھی شادی بھی ناکام ہوتی ہے تو وہ کیا کریں گے؟''

آپی کو بھی نہیں پتا تھا۔ پھر ہم نے بھائی سے بات کی تو پتہ چلا کہ بھائی کو مردوں کے جملہ حقوق ازبر تھے۔ کہنے لگے ''مرد ایک

وقت میں چار شادیاں کرسکتا ہے۔''

''بھائی اِتنا تو مجھے پتا تھا کہ مرد چار شادیاں کرسکتا ہے، وہ یکے بعد دیگرے بھی ہوسکتی ہیں اور ایک دم بھی مگر میرا سوال تو یہ ہے کہ چار کے بعد کیا ہوگا؟'' میں نے چارگی سے پوچھا ''چونکہ چاچو تو چوتھی شادی کر رہے تھے، اگر اب کی بار بھی قسمت نے یاوری نہ کی، جیسا کہ ماضی کے تجربات سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر چاچو کا کیا بنے گا، آئندہ زندگی میں وہ کیا کریں گے۔''

بھائی نے سر پیٹ لیا، اپنا نہیں بلکہ میرا، اور غصے سے کہا ''بھئی بتایا ہے ناں کہ ایک مرد ''اَن لیمیٹڈ'' تعداد میں شادیاں کر سکتا ہے مگر شرط یہ کہ ایک وقت میں اس کی صرف چار بیویاں ہوں۔''

میں نے آنکھیں پھاڑ کے بھائی کو دیکھا ''اگر اس کی چار بیویاں ہوں تو۔۔۔؟''

''تو وہ چاروں کو طلاق دے کے مزید چار شادیاں کرسکتا ہے۔'' بھائی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''بھائی، اگر اس نے صرف ایک ہی شادی اور کرنی ہوں تو؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''تو وہ صرف ایک بیوی کو چھوڑ دے۔'' بھائی نے تپے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''پر بھائی، اُس نے شادیاں تو اکٹھی کی تھیں اب وہ ایک کو کیسے طلاق دے گا؟'' میرے مزید استفسار پہ انہوں نے سر پکڑ لیا اور پورے تحمل سے تفصیلی جواب دیا ''بیٹا، ایک ساتھ شادی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ چار شادیاں ایک دن میں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرے گا۔ دو بیویاں ہوتے ہوئے اگر اس نے مزید شادی کی تو اس کے پاس تین ہوگئیں، اگر چوتھی بھی کرلے گا تو چار شادیاں ہوگئیں چار

کے بعد تعداد پوری ہوگئی ہے۔ اب اگر اس نے مزید شادی کرنا ہوئی تو وہ پہلی کو طلاق دے گا، پہلی بیوی عام طور پہ ماں باپ کی پسند ہوتی، اس سے جان چھڑانا تھوڑا مشکل کام ہے اس لیے لوگ اگلی تین میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہیں، اس میں بھی اگر انہیں کسی سے زیادہ محبت ہوتی تو وہ اسے نہیں چھوڑتے، جس سے سب سے کم انسیت ہوتی اسے چھوڑ دیتے ہوں گے۔“ اُنہوں نے تھوڑا الجھتے سلجھتے ہوئے بات مکمل کی۔

”بھائی، اگر کسی شخص کو اپنی چاروں بیویوں سے بہت محبت ہو اور کوئی اور بھی پسند آجائے تب وہ کیا کرے گا؟“

میری سوئی وہیں اٹکی دیکھ بھائی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھوں سے شرارے اور کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ غصے سے اُٹھے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کے اپنے کمرے سے باہر نکال کے ایک زوردار آواز سے دروازہ بند کردیا۔

اپنی اس روزانہ کی بنیاد پہ ہونے والی معمول کی بے عزتی پر ہمارا دل قطعاً کھٹا نہ ہوا، بغیر برا منائے ہم نے بابا کے کمرے کا رخ کیا کیونکہ یہ ڈائکیما صرف بابا ہی حل کرسکتے تھے۔

بابا پوری بات سن کے مسکرائے اور بولے ”بیٹا، ڈائکیما یہ نہیں کہ ایک شخص اپنی چار بیویوں میں سے کس ایک کو طلاق دے گا۔ اصل ڈائکیما تو یہ ہے کہ شوہر اپنی ایک عدد بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کیسے کرے گا اور کرنا تو بڑی دور کی بات ہے، سوچے گا کیسے، ویسے آپ کو کس پاگل نے بتایا کہ مرد کے اتنے حقوق ہوتے ہیں؟“ بابا نے مسکراتے لہجے میں پوچھا تو ہم نے جھٹ بھائی کا نام لے دیا۔ آخر انہوں نے تازہ تازہ ہماری بے عزتی خراب کی تھی۔

بابا نے قہقہہ لگایا اور کہا ”بیٹا، ابھی آپ کے بھائی کی شادی نہیں ہوئی، ایک بیوی آجائے پھر پوچھنا یہ سارے سوال۔۔۔ بہرحال، یہ یاد رکھو کہ مرد اس دور کی سب سے مظلوم مخلوق ہے، جس کی زندگی میں بیوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح آتی ہے اور پھر اس کی ساری خوشیوں اور خواہشات پہ غاصبانہ طور پر قابض ہوجاتی ہے۔ دوسری شادی کی خواہش تو آزادی کی خواہش ہے، جس کے بعد اس شخص پر زندگی میں دروازے بند ہوسکتے ہیں۔ پھر اپنے ہی گھر رہنے کے لیے بندے کو کمپنی کی شرائط کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ رہی چار شادیوں کی بات تو بیٹا یہ دیوانے کا خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔“ بابا نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو ہم نے چونک کے اپنے شاندار شخصیت کے مالک بابا کو دیکھا اور پوچھا ”بابا کیا آپ بھی دوسری شادی کے خواہش مند تھے؟“

بابا نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا ”بیٹا یہ خواہش تو ہر مرد کی ہوتی ہے جو دہلیز کے اُس پار بیٹھی رہتی ہے، جونہی وہ گھر سے باہر نکلتا ہے تو یہ خواہش اُس کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلتی ہے مگر گھر میں داخل ہوتے ہی یہ بھی باقی خواہشات کی طرح ڈری سہمی اُسی پار رہ جاتی ہے۔ پھر وہ شخص ہوتا اور ایسٹ انڈیا کمپنی۔“

عین وہی لمحہ تھا جب ہماری چچا میاں کے لئے اُمڈ آنے والی ہمدردی ایک دم ختم ہوگئی۔ وہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سے آزاد تھے اور نہایت پُرمسرت زندگی گزار رہے تھے۔ اگر اُن کی چوتھی شادی بھی ناکام ہوجاتی تو کم از کم اُن کی خواہشیں رہن تو نہ ہوتیں اور تو اور، وہ مزید شادی کی خواہش گھر کی دہلیز کے اندر بھی لاسکتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ آزاد تھے اور آزاد لوگوں سے کیسی ہمدردی۔

زونیرا علی کا تعلق لاہور سے ہے، جہاں آپ ہم پیدا ہونے کے لئے عمر کے کسی بھی حصے میں جایا کرتے ہیں۔ محترمہ نفسیات میں ایم ایس سی کر رہی ہیں۔ لاہوری ہونے کے ناطے سے طنزوظرافت و پھبتی سے دیرینہ / پیدائشی تعلق رکھتی ہیں اور لکھت پڑھت میں بھی اسی تعلق کو ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں۔ اُن کی متذکرہ بالا تحریر پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس خودرو پودے میں مزاح کے کس قدر شگوفے کھلے ہیں اور آئندہ نمو کا تناسب کیا ہے، اگر لکھنے پڑھنے کا شغف سلامت رہا تو اُن کا اندازِ تحریر مزید نکھر سکتا ہے اور وہ لاہوری لب و لہجے کے مزاح نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنا سکتی ہیں، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نیاز محمود

محبتوں کا سفر

مجھے یاد ہے جب مجھے پہلی بار محبت ہوئی تو چوتھی میں تھا، پھر اگلی بار ہوئی تب آٹھویں میں۔ دسویں میں پھر ہوئی اور آگے ہر سال ہوتی رہی۔ یہ محبت ہی ہے جس نے ہر مرحلے پر نئی محبت کے لیے بنیاد فراہم کی۔

بچپن میں اکثر خواب دیکھا کرتا تھا کہ کافی بارش ہوئی ہے اور میں گلی میں سائیکل چلا رہا ہوں۔ تنگ گلی ہے لوگ بھی آجا رہے ہیں اور کافی سارا کیچڑ بھی ہے۔ محبت تھی نا سو پیچھے لگ گیا اور پھر وہ دن بھی آیا جب ابو کا انتظار رہتا۔ ابو جنہیں میں خان جی کہا کرتا تھا، ڈیوٹی سے آتے اور میں راستے میں ہی ان سے سائیکل لے کے گلی کوچوں میں پھرتا۔ ایک دن پتہ نہیں کیا ہوا اور سائیکل سامنے دیوار پر چڑھا دی۔ بہت ڈر لگ رہا تھا کیونکہ سائیکل کی ساری گولائی سیدھی کر دی تھی۔ خان جی کو پتہ چلا تو سائیکل چھوڑ کے میری خیریت دریافت کی اور سینے سے لگایا۔ میرا خیال تھا اب سائیکل میرے لیے شجر ممنوعہ قرار دے دی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شروع شروع میں سائیکل مجھ سے بڑی تھی اور بمشکل میرے پاوں پیڈل تک پہنچتے۔ میں پیڈل پش کر کے دوسرے پیڈل کے اوپر آنے کا انتظار کرتا اور جب پیڈل پاوں کی گرفت میں آتا تو اسے پش کر دیتا۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا اور میں اپنی۔۔۔ آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے سائیکل پر میری گرفت مضبوط ہوتی گئی اور اب اس پر مختلف کرتب سیکھنا میرا محبوب مشغلہ ٹھہرا۔ یوں کہیئے میری محبت بچپن سے لڑکپن میں اور لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنے لگی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ سکول سے چھٹی ہوئی۔۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی سو جلد بازی میں سائیکل ٹرک سے ٹکرا دی۔ اللہ کا کرم تھا کہ میں بچ گیا اور سائیکل مکمل تباہ۔۔۔ اس بار بھی خان جی شفقت میں سب کچھ بھول گئے۔۔ لیکن اب میرا دل اچاٹ ہوگیا۔

سکول میں کرکٹ ٹیم کی سلیکشن کے لیے ٹرائل چل رہے تھے سو میں بھی دوڑ میں شامل ہوا اور یوں میری نئی محبت شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی مجھے پڑھائی کا بھی شوق تھا اور ہر جماعت میں نمایاں نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔

اُنہی دنوں وہ والی محبت بھی چل نکلی جو لگائے نہ لگے اور بجائے نہ بجے۔ اک عجیب سرور تھا۔ اک عجیب نشہ تھا۔ یوں آہستہ آہستہ میں اپنی پہلی محبتیں ہارتا رہا۔ پھر اک وقت آیا کہ دنیا سے ہی دل بھر گیا۔ دنیا کی بے ثباتی اور دوغلے پن نے ایسا زخم دیا کہ مرہم ملنے کی بجائے مرہم گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ محبتیں پھر شروع ہوئیں۔ ہر سال نئی محبت۔

اب کی بار شاعری محبوبہ کا روپ دھار گئی۔ روز و شب ایک ہی کام۔ ہر وقت ہاتھ میں ڈائری، بے

تکے، بے ہنگ و آہنگ شعر الا پنے لگا۔ ابتدا مشہور شعرا کے نظموں کا حلیہ بگاڑنے سے کی۔ اور الف بائی ترتیب سے آغاز کرتے ہوئے اقبال کی نظم ''ماں کا خواب'' کا انتخاب ہوا۔ اس سلسلے میں اگلا شکار داغ دہلوی کا کلام ''ساز یہ کینہ ساز کیا جانے'' ٹھہرا۔ ان کا ایسا حلیہ بگاڑا کہ الامان والحفیظ۔۔۔ ڈائریاں بھر گئیں لیکن محبت میں رازداری کے سب سے زیادہ قائل تھے سو آج تک ان ڈائریوں پر کسی کی نظر نہ پڑنے دی۔ اور پڑنے دیتے بھی کیوں؟ اپنا مذاق بنوانا تھا کیا؟؟ پھر یہ محبت بھی انجام تک پہنچی۔

گریجویشن کر لی اور عملی زندگی میں قدم رکھا اور تب سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر سال نئی محبتیں پالتا ہوں۔ کچھ کو پالیتا ہوں کچھ گنوا دیتا ہوں۔ کچھ کو بیچ چوراہے چھوڑ دیتا ہوں کچھ کو پار لگا دیتا ہوں۔ محبتیں تو محبتیں ہوتی ہیں ان کا بھی بھلا کسی نے حساب کتاب رکھا ہے، بس کرتے جاؤ۔ اپنے کام سے محبت۔ اپنے پیشے سے محبت۔ اپنے مشن سے محبت۔ انسانیت سے محبت۔ ہاں ایک بات کہ نفرت بھی ہونی چاہیئے۔ نفرت بھی اتنی ضروری ہے جتنی محبت بلکہ محبت سے زیادہ نفرت ضروری ہے۔ نفرت کرو، برے کاموں سے۔ بری صحبت سے۔ برے انجام سے۔ برے عادات سے۔ کیونکہ یہ نفرت ہی ہے جو آپ کو ان کاموں سے روکتی ہے جسے آپ ناپسند کرتے ہیں۔ نفرت اور محبت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آپ کا کسی چیز سے نفرت اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس چیز کی ضد سے محبت کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص کی دانائی بہت مشہور تھی۔ کسی نے اس دانا شخص سے پوچھا کہ آپ نے اتنی دانائی کس سے سیکھی؟ اس نے جواب دیا کہ نادان اور کم عقل و کم فہم لوگوں سے۔ پوچھا، '' وہ کیسے؟'' جواب دیا کہ جو وہ کرتے ہیں میں وہ نہیں کرتا۔

لہٰذا نفرت بھی ہمیں محبت کرنا سکھاتی ہے۔ ان چیزوں کا بھی تعین کریں جن سے آپ نے نفرت کرنی ہے تاکہ ہم محبتیں پال سکھیں۔ محبتیں بانٹ سکیں۔ محبتیں پا سکیں۔

نیاز محمود صاحب کا تعلق ''چھوٹا لاہور'' صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا ''قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن''۔ ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ اور افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح سے بھی فطری رغبت ہے جو انہیں ''ارمغانِ ابتسام'' کی طرف لے آئی ہے۔ معاشرے کے عمومی موضوعات کو طنز و مزاح کی خصوصی عینک سے دیکھنا ان کی تحریر کا امتیازی نشان ہے۔

ابنِ ریاض

جدید سرقے

ہمارے ہاں چوری ہو جانا یا ڈاکہ پڑ جانا بالکل معمول کی بات ہے۔ اِتنی معمولی کہ اکثر یہ خبر بھی نہیں بن پاتی۔ وجہ جگہ کی کمی کہ قتل، اغوا برائے تاوان، بھتہ سیاسی، کھیل اور شوبز کی خبروں سے جگہ بچ پائے تو یہ معمولی خبریں بھی باعثِ کریم ٹھہریں۔ ویسے بھی ہمارے ممدوح ابن انشاء کے بقول "خبر وہ ہوتی ہے جو معمول سے ہٹ کر ہو۔ مثلاً اگر کسی آدمی کو کتا کاٹ لے تو یہ کوئی خبر نہیں ہے کیونکہ کتے کا کام ہی کاٹنا ہے۔ تاہم اگر کوئی انسان کسی کتے کو کاٹ لے تو یہ خبر بنتی ہے۔"

چند ماہ قبل ہمارے گھر میں بھی چوری ہوئی تھی مگر چونکہ یہ واقعہ خبر کی تعریف پر پورا نہیں اترتا تھا سو کسی اخبار نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اب جرائم میں بھی جدت آ گئی ہے۔ اب فرسودہ طریقے متروک ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے اندازے عموماً ٹھیک ثابت ہوتے ہیں۔ اس میں ہمارا کمال نہیں بلکہ یہ قدرت کا ہم پر کرم ہے۔ چند روز قبل ہمیں ایک معروف ادیبہ نے فیس بک آئی ڈی پر کچھ بھیجا۔ ہم نے سوچا کہ ایک معروف ادیب بھیج رہی ہے ضرور کوئی خاصے کی چیز ہو گی۔ ہمارا اندازہ سولہ آنے دُرست ثابت ہوا اور وہ بہت ہی خاص چیز نکلی۔ کیونکہ وہ کھولنے کی دیر تھی ہاری آئی ڈی ہماری نہ رہی اور بھیجنے والے پر فدا ہو گئی۔ ہم تو سو گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا جب لاہور، فیصل آباد، پشاور، کراچی الغرض پورے ملک سے کالوں کا تانتا بندھ گیا اور بہی خواہوں نے کالز کر کر کے ہمیں اس سانحے سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ آئی ڈی بند کروا دیں۔ ہمیں تو اس کی اتنی فکر نہیں تھی کہ ہمارے آئی ڈی میں بقول شاعر۔

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ سامان نکلا

کچھ ایسا خاص نہیں تھا کہ ہمارے لئے باعث پریشانی ہوتا ہم یہ آئی ڈی بلاک کر کے نئی بنانے کے حق میں بھی نہیں تھے کہ نئی آئی ڈی پر دوبارہ اتنا اکٹھ کرنا کوئی ایسا آسان کام بھی نہیں۔

ہم نے تو اسے بہت آسان لیا۔ تاہم یہ ہماری غلط فہمی تھی اور نیٹ یا فیس بک سے کم علمی بھی۔ ہماری آئی ڈی سے ایسا مواد شائع کیا گیا جس سے ہم قطعاً آگاہ نہ تھے۔ ہماری آئی ڈی

سے کچھ خواتین کی تصاویر بھی شائع کی گئیں۔ان کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کا ہمیں علم نہیں۔اگر وہ حقیقی ہیں تو ہم مذکورہ خاتون/خواتین سے معذرت خواہ ہیں اور نادم بھی ہیں کہ ہماری آئی ڈی اس گرے ہوئے کام کے لئے استعمال ہوئی۔ہم اپنی آئی ڈی پر ماسوائے اپنے کالموں کے کچھ پوسٹ نہیں کرتے۔اکثر تو وہ بھی رہ جاتے ہیں ہم سے۔عفت مآب ایسے ہیں کہ اپنی تصویر بھی کبھی نہیں لگائی بس دوستوں نے کالمسٹ کونسل آف پاکستان سے ملنے والی سند کی تصویر لگا دی جس سے لوگوں کو ہمارے خال وخد کا اندازہ ہوا۔تین چار مرتبہ ابنِ ریاض نامی آئی ڈیز رپورٹ ہونے اور بعد ازاں ان سے ہاتھ دھونے کے بعد اب ایک آدھ تصویر ہم نے لگا دی ہے۔فیس بک پر ہم ہی امیر نہیں ہیں کہ جس کی آئی ڈی چوری ہوئی بلکہ ہم نے اکثر دوستوں بالخصوص لکھنے والے ساتھیوں کے
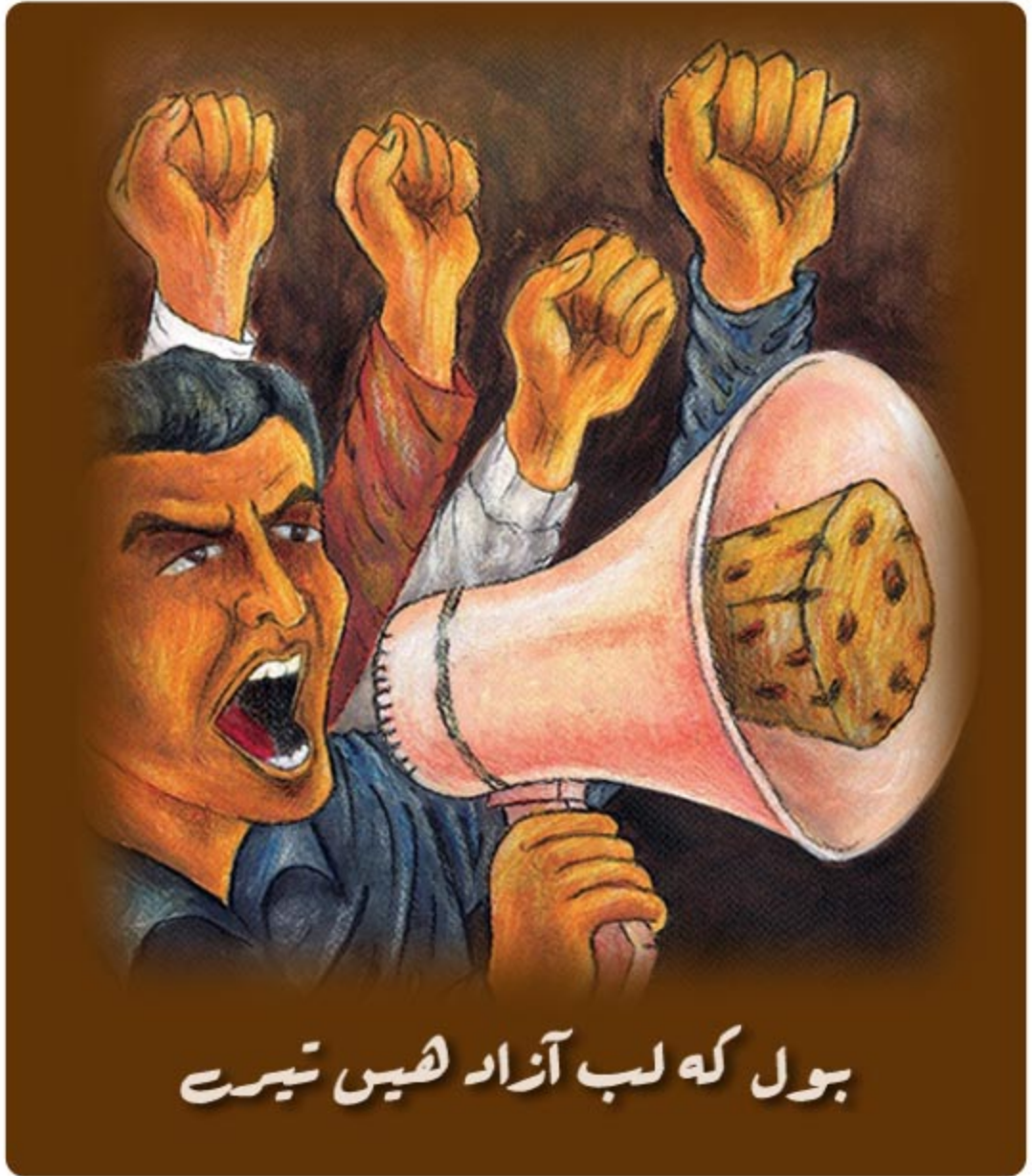
پیغامات پڑھے ہیں کہ اس کی آئی ڈی ہیک ہوگئی ہے، اگر کسی کو اس آئی ڈی سے کوئی غیر اخلاقی پیغام ملے یا کوئی اور ایسی پوسٹ ملے تو حاملِ آئی ڈی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب کسی حاسد چور کی کارستانی ہے جو اس کے حلقۂ احباب میں اسے بدنام کرنا چاہتا ہے۔

پاکستان میں فیس بک اکاؤنٹ کی چوری کراچی میں موبائل چوری سے بھی زیادہ ہی ہے۔ ایک مرتبہ ہماری رقم چرانے کا منصوبہ بھی بنایا گیا تھا مگر وہ ناکام اس لئے ہوگیا کہ ہمارے پاس رقم تھی ہی نہیں۔ یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب ہم ماسٹرز کے طالب علم تھے اور ''یاہو میسنجر'' استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک خاتون نما آئی ڈی سے ہیلو کی گئی۔ ہم نے جواب دیا اور تعارف پوچھا تو معلوم ہوا کہ سوڈانی خاتون تھی اور لندن میں علاج کروا رہی تھی۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ میاں وفات پا چکا تھا۔ اولاد تھی کوئی نہیں۔ خود اس کو کینسر تھا اور وہ بھی اختتامی مرحلے میں۔ اس کے پاس نو ملین پاؤنڈ پڑے تھے اور وہ پریشان تھی کہ اتنی رقم کس کے حوالے کرے۔ یہ تفصیل سن کر ہم نے پوچھا ''تو اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' کہنے لگی کہ ہمیں تم پر اعتبار ہے۔ تم یہ رقم لے لو اور اس کا ایک میرے نام سے ٹرسٹ بنانا غریبوں کے لئے۔ اس میں سے ایک ملین پاؤنڈ خود رکھ لینا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ ہم پر تو اپنے گھر والے اعتبار نہیں کرتے، سبزی کے پیسے دے کر بھی پوچھتے ہیں کہ کہاں کہاں خرچ کئے اور بقایا واپس لے لیتے ہیں۔ کہاں ایک افریقی شہزادی اپنے کروڑوں اربوں روپے ہمیں دینا چاہتی ہے اور ہیلو کرنے سے ہی اسے ہم پر اعتبار ہوگیا۔ واقعی مردم شناس عورت ہے۔ ہم نے کہا ''بالکل ٹرسٹ بنائیں گے اور تمھارے ہی نام کا بنائیں گے۔ بس رقم ہمارے حوالے کرو۔''

اگلے روز ایک اجنبی کی ای۔ میل آئی جس میں اس نے کہا کہ وہ اس خاتون کا وکیل ہے اور اس نے آپ کو اپنی رقم کا وارث قرار دیا ہے اور وارث ملتے ہی خوشی سے اللہ کو پیاری ہوگئی ہے۔ نیز کہا کہ اسے وصیت کرگئی ہے کہ رقم ہم تک پہنچائے۔ ہم نے کہا کہ اللہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آپ رقم ہم تک پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو کہنے لگا کہ میں حلف نامہ بناتا ہوں۔ اگلے دن حلف نامے پر ہمارے دستخط لئے۔ ہم نے کر دیئے۔ پھر کہنے لگا کہ اب بینک سے رقم کی منتقلی کے لئے پانچ ہزار پاؤنڈ بھیج دیں۔ ہم نے کہا کہ جناب جو رقم ہمیں ملنی ہے اس میں سے دس ہزار پاؤنڈ کم کرلیں۔ پانچ ہزار سے رقم منتقل کریں اور پانچ ہزار ہماری طرف سے آپ کو تحفہ۔ آخر ہم سیٹھ عمران سمجھنے لگے تھے خود کو۔ کہنے لگا کہ ایسے نہیں ہوسکتا۔ رقم پہلے جمع کروانا پڑتی ہے۔ ہم نے کہا کہ وہ آپ ہی جمع کروا دیں۔ آپ کی مؤکل کو ہم پر اعتبار تھا تو آپ کو بھی کرنا چاہیے۔ پھر کہنے لگا ''اچھا ایسا کریں چار ہزار پاؤنڈ ہی بھیج دیں، ایک ہزار پاؤنڈ کا میں انتظام کرتا ہوں۔'' ہم نے کہا کہ جناب ہمارے پاس تو کل چار ہزار روپے ہیں۔ اگر اس سے کچھ کام چلتا ہے تو ہم بھیج دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس وکیل نے ہم سے بات نہیں کی۔ ہماری رقم ہڑپ کرگیا ہوگا۔ کوئی نہیں، اوپر جا کر ہم اس سے حساب لے لیں گے۔

یہ انفرادی سرقے ہیں، اب تو اجتماعی سرقے بھی حیرت کی بات نہیں۔ اجتماعی چوری کی ایک جدید شکل انتخابات میں نظر آتی ہے۔ اس کے متعلق ہم زیادہ نہیں جانتے۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ ووٹ یا مینڈیٹ کی چوری کہلاتی ہے۔ عموماً ہارنے والی پارٹی کا مینڈیٹ جیتنے والی پارٹی چوری کیا کرتی ہے۔

ابنِ ریاض صاحب کا اصل نام ''عمران احمد اعوان'' ہے۔ پیشہ صحافت ہے۔ ''انویسٹیگیٹو کونسل آف کالمسٹ'' کے چیف آرگنائزر ہیں۔ ''شگوفۂ سحر'' کے نام سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ ان کے کالم مختلف اخباروں اور جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ اندازِ تحریر خاصا شگفتہ اور برجستہ ہے۔ سیاسی و سماجی تجزیہ نگاری ان کا میدان ہے۔ ابنِ انشاء سے متاثر ہیں اور نثر نگاری میں اُنھی کے اُسلوب کی پیروی کرتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔

عائشہ تنویر

ہمارے اُستاد

پچھلی صدی میں والدین کو اپنی اولاد پر خود ان سے زیادہ حقوق حاصل ہوا کرتے تھے، جن میں سے آدھے وہ بخوشی اساتذہ کو منتقل کر دیتے۔ پھر والدین اور اساتذہ مل کر پیار، محبت سے بچوں کی ”عملی“ تربیت کرتے۔

سیانے کہہ گئے ہیں کہ ڈانٹ، مار دراصل پیار کا ہی عملی اظہار ہے تو والدین سے زیادہ بچوں کو کون پیار کر سکتا ہے۔ اساتذہ جہاں پیار کے اظہار میں یہ احتیاط کیا کرتے تھے کہ نشانی نہ رہے اور نظر بد نہ لگے۔ تو والدین پیار کے اظہار میں یہ خیال ضرور کرتے کہ دوا دارو کا خرچہ نہ ہو۔

”گوشت آپ کا، ہڈیاں ہماری“ والے اُس دور میں ملنے والی مراعات کا جب اساتذہ نے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا اور حقیقی والدین کے حصے کی ہڈیاں بھی خود ہی توڑ دینے کے درپے ہوئے تو والدین بلبلا اٹھے۔ آخر کبھی ان کے ہاتھ میں بھی خارش ہوتی ہے تھپڑ لگانے کی، ان کا بھی تو مار پیٹ کا حق ہے۔

اپنے حقوق کے لیے جب والدین نے آواز اٹھائی تو بھاری فیس لینے والے اسکولوں میں بچوں کو مارنا تو درکنار ڈانٹنا بھی استاد کے لیے جرم بن گیا۔ ان کا کام خاموشی سے اچھے بچوں، اوہ معذرت اچھے استاد کی طرح آ کر سبق دہرانا رہ گیا۔

پہلے چونکہ انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی تو والدین اور اساتذہ کے ساتھ دیگر گلی، محلے کے یا رشتہ دار بزرگ بھی بچوں کی تربیت میں حسبِ توفیق حصہ ڈالنے کو آتے، جاتے ڈانٹ ڈپٹ کر دیتے۔ مواصلاتی ذرائع بڑھنے سے جہاں والدین کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا، وہاں وہ مار پیٹ کے بچوں کی نفسیات پر اثرات جان کر دنگ رہ گئے۔ یوں مار کے بجائے پیار سے بچے پالنے کے دور کا آغاز ہوا۔

ہمارے بچے آج کے دور کے ہیں اور انہیں سنبھالنا کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ ہمارے آباء نہیں لگا سکتے۔ پہلے ہمارے والدین ہمیں سکھاتے تھے، تو ہم سیکھتے نہ تھے۔ اب ہمارے بچے ہمیں سکھاتے ہیں تو سیکھے بناء چارہ نہیں ہے۔

بچپن میں ذرا ہم نے اچھل کود کی اور کوئی نہ کوئی ڈانٹنے آ گیا۔ ”قیامت کے دن زمین شکایت کرے گی اللہ سے۔“

ہم بیچارے وہیں سہم کر بیٹھ جاتے۔

اب کسی بات پر ذرا زیادہ سیخ پا ہو گئے تو سہمنے کی بجائے دھمکی مل گئی۔

”جو مما اپنے بچوں کو ڈانٹتی رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں گناہ دیتے ہیں۔“ اپنے تین سالہ بیٹے کے منہ سے یہ فرمان سن کر ہم ششدر رہ گئے۔ فوراً دل ہی دل میں اللہ سے استغفار شروع

کی۔

صد افسوس کہ حقوق اللہ، حقوقِ والدین کے بعد حقوق اولاد کی ادائیگی میں بھی ہم ناکام ہی رہ گئے۔

ہم بہن بھائی بھی آپس میں لڑتے تھے لیکن اپوزیشن اور حکومت کی طرح بیان بازی کی سمجھ اس دور میں ہم معصوموں کو کہاں تھی۔

دھرنے کے دور میں بڑی ہونے والی ہماری پانچ سالہ صاحبزادی نے ماہ رمضان میں بے نیازی سے خود سے دو سال چھوٹے بھائی کے بارے میں بیان داغا ''مما طلحہ تو کبھی روزہ نہیں رکھ سکتا۔''

''کیوں؟'' کم عمری ایک الگ بحث تھی لیکن اس ''کبھی نہیں'' کے پیچھے کا راز ہم نے بہت تجسس سے دریافت کیا۔

''روزہ صرف کھانا پینا چھوڑنے کا نام ہی نہیں، گندے کام بھی چھوڑنے پڑتے ہیں اور یہ تو ہر وقت ہم سے لڑتا رہتا ہے۔''

تمام جنگوں کو یک طرفہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے جو جملہ کسا، وہ حملے سے کم نہ تھا۔ یہ جملہ ہم نے ہی شاید انہیں روزے کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

طلحہ صاحب غصے سے جواب دینے آئے ''تم بھی روزہ نہیں رکھ سکتی!''

اس سے قبل کہ جملہ در جملہ، حملہ در حملہ میں تبدیل ہوتا، ہم نے کیا، کیوں کا سوال اٹھائے بناء موضوع بدل کر صلح کا پرچم لہرایا۔ البتہ اس جملے پر بڑے صاحبزادے کا سوال ضرور دماغ پر ہتھوڑے برساتا رہا ''روزے میں گندے کام چھوڑ دیتے ہیں، بعد میں تو کر لیتے ہیں نامما۔''

اس سوال پر ہم بس چلو بھر پانی ہی ڈھونڈتے رہ گئے۔

دیکھا جائے تو قصور بچوں کا بھی نہیں، فرق تو طرز زندگی کا ہے۔ والدین بچے کی محبت میں ایک جگہ اس کی پسند کا خیال کرتے ہیں اور فرمانبردار بچے دس جگہ خود کروا لیتے ہیں۔

اِن بچوں کو فرمائش کرنے اور من پسند چیز حاصل کرنے کی یوں عادت ہوتی ہے کہ جب عید الاضحی پر ہم نے دلار سے کہانیاں

سنا کر اور فوائد سنا کر انہیں گوشت کھانے کے لیے راضی کیا تو فرمایا ''ٹھیک ہے لیکن بوٹی چھوٹے والے، بغیر سینگ کے بکرے کی ہو۔''

ہم آہ بھر کر وہ زمانہ یاد کر کے رہ گئے جب ابو جی کے سامنے ٹنڈے کھانے سے انکار کیا تو انہوں نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ بے اختیار کئی خوش کن خیالات نے دل میں جگہ بنائی لیکن دماغ بہرحال جیت گیا۔

ابو جی کو ہمارا ساتھ مطلوب نہیں تھا بلکہ انہوں نے رزق کی ناقدری اور نخرے دکھانے کے جرم میں سارا سالن ہمارے لیے مختص کر دیا تھا۔ اب جب تک ٹنڈے کا سالن ختم نہ ہوتا، ہمیں کچھ اور نہیں ملتا تھا۔ اُس دن سے ٹنڈوں کا ایسا احترام دل میں جنم لیا کہ کبھی کسی کے سامنے ٹنڈے کھانے سے انکار کی ہمت نہیں ہوئی۔

کاش ہم اِن کیش آن ڈیلیوری والے پر پلنے والے بچوں کے ساتھ ایسا کر سکتے جو ایک کال پر پزا منگوا سکتے ہیں۔ ہمیں تو پڑوس والی خالہ کڑھی بھی اس لیے نہیں دیتی تھیں کہ تمہاری ماں منع کر گئی ہے، گلا خراب ہو گا۔

کسی کے گھر مہمان جاتے تو امی کی گھوریاں مسلسل چائے کے سامان پر یلغار سے منع کرتی نظر آتیں، پھر بھی دل للچانے پر تیز مرچوں والے کباب سی، سی کرتے یہ سوچ کر کھا لیتے کہ کوئی بات نہیں گھر جا کر تھوڑی ڈانٹ بھی کھا لیں گے، کھانے والی چیز سے کیسا پرہیز۔ آج کل کے بچے کہیں مہمان بن کر جائیں تو پہلے والدہ ان کی پسند، ناپسند سے آگاہ کرتی ہیں۔ والدہ کچھ مروت کا مظاہرہ کر لیں تو میزبان کے اصرار پر بچے کمال اعتماد سے بتا دیتے کہ ''یہ جو میکرونی میں شملہ مرچ ڈالی ہے آپ نے، یہ مجھے بالکل پسند نہیں۔''

میزبان یا تو شرمندہ ہو جاتی ہیں یا مہمان کو شرمندہ کرنے والی نظروں سے گھورتی اپنی اچھی تربیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بچوں میں سے کسی کو آواز دیتی ہیں۔ یہ اور بات کہ ان کے بچے بھی اکیسویں صدی کے ہی ہوتے ہیں سو پورے ادب سے بے ادبی کر کے ماں کو غرور کرنے موقع نہیں دیتے۔

بات صرف یہ ہے کہ ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے دیگر اشیاء کی طرح اب ادب و تمیز کے معیارات بھی معیاری نہیں رہے۔

ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں ہم نے ابو کا دستخط کرنے کی بہت مشق کی تا کہ ٹیسٹ کا پیپر پر خود دستخط کر کے والد محترم پر سے اضافی کاموں کا بوجھ ہٹایا جا سکے۔ ہمارے بچوں کو اس محنت کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ متعدد بار پاس ورڈ بھولنے اور پھر صاحبزادے کی مدد سے دوبارہ حاصل کرنے کے بعد ہمارا ای میل باکس ان کی دسترس میں ہے اور ماشاءاللہ آج تک ان کے تعلیمی اداروں سے عام معلوماتی ای میل کے علاوہ کوئی شکایتی ای میل موصول نہیں ہوئی۔

عہد جدید کے بچے چونکہ ایجادات کے دور میں پیدا ہوئے

کچھ عرصہ قبل ہماری ملاقات اپنے ایک دیرینہ دوست سے ہوئی جو آج کل گرین کارڈ پر امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ کبھی کبھار طوفانی دورے پر پاکستان آتے ہیں اور یہاں وطن اور اہل وطن میں نئی نئی خامیاں نکال کر ان کا نوحہ پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مغربی ممالک کا سرد موسم ایشیائی باشندوں پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوا ہے اور ان کی طبیعتوں میں بے تحاشا سرد مہری آ گئی ہے۔ خاص طور پر اپنے وطن سے وہاں گئے ہوئے مہمانوں کے حق میں تو ان کی بے حسی کی کوئی حد نہیں۔ ہمارے دوست نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ بتایا ''Guests are treated as pests there'' کیونکہ وہاں کسی کو کسی دوسرے کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہے اور نہ ضرورت۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ وہ ہمیں یہ سب باتیں بطور حفظ ماتقدم بتا رہے ہیں کہ کہیں ہم ان کی میزبانی سے فیضیاب ہونے کے لیے ان کے پاس نہ جا دھمکیں۔

پہاڑ تلے از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ہیں، اس لیے ان کے والدین ان کی نگرانی کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں بلکہ اب اولاد والدین کو سوشل میڈیا اکاؤنٹ بنا کر دیتی ہے اور ان کے استعمال پر نظر رکھتی ہے۔

یہاں ہم کمنٹ میں قیمت معلوم کرتے، وہاں سے صاحبزادے فرمادیتے ''یہ گھٹیا برانڈ میں نہیں پہنوں گا یا اس شرٹ کا ڈیزائن اچھا نہیں۔''

ہم دل مسوس کر رہ جاتے۔

سوشل میڈیا پر ہمارا کام یہی رہ گیا تھا کہ اپنے بچوں کی بھیجی نت نئے ناموں والی پرانی تراکیب گھر میں بنانے کی کوشش کریں۔

جب بھی ہم ذرا اپنی چادر سے باہر نکلنا چاہتے، کوئی سیلفی، کوئی سٹیٹس اپلوڈ کرنا چاہتے تو ہمارا پچھلی صدی کا چہرہ اس بات کی اجازت نہ دیتا۔ اپنے سامنے پلے بڑھے بچوں کی سوشل میڈیا پر تصاویر دیکھ کر آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ جب ان سے اس کایا پلٹ کی وجہ دریافت کرو تو وہ پھر کسی نئی ایپ سے متعارف کروا دیتے ہیں۔

جتنی ایپس آج کل کے بچے استعمال کرتے ہیں، اتنے تو ہمارے اسکول میں کمرے نہیں تھے۔ حتیٰ کہ ان بچوں کو کچھ بھی نیا سیکھنے کے لیے ایک نئی ایپ درکار ہوتی ہے۔

پرانے زمانے کے بدتمیز بچوں کی طرح، یہ بچے والدین کے آگے یا پیچھے زبان ہرگز نہیں چلاتے بلکہ زیادہ تر وقت خاموشی سے اپنے موبائل فون کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ انہیں پارکس میں جا کر کھیلنے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے لیکن ایک تو آج کل پارکس کی تعداد بہت کم ہے۔ دوسرا امن و امان کی ناقص صورتحال کے باعث عوامی مقامات پر گیجٹس لے جانے کی بجائے گھر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ بچے انسانیت کی مدد اور اتحاد بین المسلمین کے قائل اور ذات پات کے نظام کے خلاف ہوتے ہیں۔ ہماری طرح کولہو کا بیل بن کر اپنے گھر اور محلے کے چند لوگوں تک اپنی خدمات محدود کرنے کی بجائے ان کا دائرہ احباب پوری دنیا میں پھیلا ہوتا ہے۔ کبھی امریکہ میں کسی دوست کو بریک اپ کے بعد تسلی دے رہے ہوتے تو کبھی کسی دور دراز گاؤں کے ساتھی کو فصل اچھی ہونے پر مبارکباد سے نوازتے۔

ہمارے بچے صرف ماں یا باپ کا عالمی دن ہی نہیں مناتے تھے بلکہ مشرقی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اکثر ہمیں اپنی ڈسپلے پکچر پر بھی جگہ دیتے ہیں۔ ''سیلبریٹنگ مائی مدرز برتھ ڈے'' کا اسٹیٹس ڈالتے۔ بلکہ جس دن ہمارا آپریشن تھا، اس دن تو انہوں نے نہ صرف دعا کی اپیل کی بلکہ ایک ایک کمنٹ کا جواب بھی دیا۔ چند حاسد رشتہ داروں نے ہمیں یہ کہہ کر بھڑکانے کی کوشش کی کہ اولاد کو تمہاری پرواہ ہی نہیں، خدمت کی بجائے موبائل میں لگی ہے۔ اب جدید اولاد کے تربیت یافتہ ہم جیسے ماڈرن والدین ان پرانے دور کے لاعلم والدین کو ہم کیا جواب دیتے سو مسکرا کر ٹال دیا۔

اپنی تمام جدیدیت کے باوجود ہمارے بچے تو اتنے روایتی تھے کہ آج تک گرینڈ پیرنٹس کا دن بھی مناتے ہیں۔ ناسازیٔ طبع کے باعث جتنے دن ان کے نانا ہسپتال میں رہے، روزانہ ان کے ساتھ ایک نئی سیلفی لینے جاتے ورنہ دیگر بہت سے لوگ تو یہ زحمت بھی نہیں کرتے۔ نانا کے لیے تیار پرہیزی کھانا منگوانے کا طریقہ بھی انہوں نے بتایا۔ نانا کی بیماری کے دوران ''گٹ ویل سون'' کا ایونٹ بنایا اور پھر ان کے غسل صحت کے لیے جگہ تجویز کرنے تک آگے آگے رہے۔ اب اتنی تگ ودو کے بعد بھی ان کی محبت پر شک کیا جائے تو وہ منہ بگاڑ کر یہی کہیں گے Who cares!!

عائشہ تنویر صاحبہ کا تعلق کراچی سے ہے۔ محترمہ نے ریاضی میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔ میدانِ ادب میں نو وارد ہیں لیکن اندازِ بیان کی پختگی اور لب و لہجے کی چلبلاہٹ اور بیساختگی سے اُن کے فکاہی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ طنز و مزاح، بچوں کی کہانیاں اور سماجی و معاشرتی موضوعات کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ مختلف بچوں اور خواتین کے جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ''ارمغان ابتسام'' کے لیے بھی گاہے گاہے بازخواں ہوتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر امواج الساحل

ڈالڈا سے جاسوسی تک

جب میں نے قطر کی سرزمیں پر قدم رنجہ فرمایا تو اس وقت دس سال کی عمر میں میرا شمار بچوں میں ہی کیا جاتا تھا، یہ الگ بات کہ پاکستان میں پرائمری پاس کر لی تھی۔ یہاں پہ تو جیسے کتابوں کا قحط تھا، سوائے نصابی کتابوں کے، کوئی کسی بھی قسم کی کتاب نہ ملتی، (ویسے اب بھی اُردو کا یہی حال ہے) نصاب کی کتابیں، کاپیاں پنسلز، ربر، پنسل تراش تک کے تمام لوازمات حکومت مفت میں مہیا کرتی۔ یہاں تک کہ جیومیٹری بکس بھی تقسیم ہوتے تھے۔

ہر دو سال بعد پاکستان جاتے تو والد صاحب کچھ رسالے سال دو سال کے لئے جاری کروا دیتے۔ اگر میری یادداشت دھوکہ نہیں دے رہی تو ان میں ''ہمدرد صحت''، ''ہمدرد نونہال'' اور ''تعلیم و تربیت'' بھی شامل تھے، میں ان تمام رسالوں کو بہت شوق سے پڑھا کرتی، پھر یہاں کی عربی خاصی مشکل ہوگئی اور والد گرامی نے بھی رسالے جاری کروانے چھوڑ دیے کیوں کہ اکثر علم کے شوقین راستے میں ہی کہیں انہیں خرد برد کر دیتے۔ دوستوں سے جو مل جاتا گھر لا کر پڑھتے، میرا بھی ناشتہ ہو جاتا، امی کی ڈانٹ سنی پڑتی بیچ میں ابو بھی الگ لپیٹے جاتے کہ لڑکی کو خراب کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے، غضب خدا کا سسرال جا کر یہ رسالے مانگے گی اور وہ انہیں میرے ماتھے کا کلنک کہہ کر بالوں سے پکڑ کر گھر سے نکال دیں گے۔

بہر حال، گرمیوں کے ایک گرم ترین دن میں امی نے مجھے دیکھا کہ کچن میں ہوں اور ڈالڈا کا ڈبہ سامنے رکھ کر نہ جانے کون سی فلسفیانہ قسم کی سوچوں میں گم ہوں، پوچھنے پر بتا بھی نہیں رہی، کہ ڈانٹ پڑنے کا خطرہ تھا۔ مگر امی نے اگلوا کر ہی دم لیا۔ ورنہ ان کا پارہ چڑھتا ہی جانا تھا۔ مجھے بتانا ہی پڑا کہ ڈبے پر لکھائی پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں، انہیں بہت کوفت ہوئی کہ فضول کام میں اپنا وقت برباد کر رہی ہوں، جب کہ میرے ذہن میں یہ وقت برباد ہرگز نہیں تھا۔

انگلش میں لکھی ہوئی عبارت کی رو سے مجھے ڈ، ا، ل کی پہچان ہوگئی، بس انہی تین حروف پر اکتفا کرنا پڑا۔ مگر ہندی فلمیں دیکھتے ہوئے کبھی کبھی ہندی جاننے کی حسرت دل میں انگڑائیاں لیتی رہتی۔ لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ عربی نے ایسا جکڑا کہ تیس پینتیس سال جیسے پلک جھپکتے ہی گزر

کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ الگ بات ہے کہ جھوٹ بولنے والوں کو اکثر دوسروں کے پاؤں پکڑنے پڑتے ہیں۔ اور جھوٹ کے ہاتھ بھی نہیں ہوتے بلکہ منہ، ناک، کان اور چہرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود جھوٹ کا حدود اربعہ لامحدود ہوتا ہے۔ پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے جھوٹ کا زیادہ دیر تک چلنا ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے اس کا کھوج لگانے والے اسے راہ ہی میں جان لیتے ہیں۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار بھی نہیں کہ جھوٹ کی پرواز بہت اونچی ہے۔ جھوٹ کسی پرندے کی صورت میں اپنے پروں کی بدولت اونچی فضاؤں میں سفر کرتا ہے۔ بظاہر تو جھوٹ کی یہ پرواز دیکھنے والوں کو بہت اونچی اور بھلی لگتی ہے۔ لیکن جب اسے کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے تو سبھی کچھ فضا میں ہی بکھر جاتا ہے۔ یار لوگ ہوائی قلعوں کی طرح جھوٹ کی بنیادوں پر بھی بلند و بالا اور اعلیٰ شان والی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن ناقص میٹریل کی وجہ سے جلد ہی یہ زمین بوس ہو جاتی ہیں۔

شامتِ اعمال از اظہر سلیم مجوکہ

گئے، پتہ ہی نہ چلا کب زندگی مائل بہ زوال ہوئی اور ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا۔

نیٹ کا زمانہ آ چکا تھا، میں نے بھی سیکھ لیا فراغت ملی تو ہندی سیکھنا بھی یاد آ گیا۔ ایک دن سرچ کیا تو ہندی کی تعلیم مل گئی، میں نے سیکھنی شروع کر دی، اور نوٹس بنانے لگ گئی، تین چار مہینے خوب محنت کی، کچھ جاب کے دوران ایک انڈین ٹیچر سے شناسائی ہوئی تھی تو اس سے سیکھے ہوئے حروف کام آئے۔ اب نیٹ پر لگے ہوئے اشعار پڑھنے کے قابل ہو گئی، تو اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر ہندی کی پریکٹس کر لیتی۔

ایک دن یہاں پہ موجود اکلوتی پاکستانی بک شاپ جو کہ اب ناپید ہو چکی ہے، پر جانا ہوا تو وہاں ہندی کی کتابیں دیکھیں۔ میں نے ایک تعلیمی کتاب اور ایک ڈکشنری کا انتخاب کیا اور میرے شوہر نے وہ کتابیں کاؤنٹر پر رکھیں۔

دکاندار تو دیکھ کر چونک گیا۔ مجھ سے ایک ہی سانس میں یہ سارے سوال پوچھ ڈالے "یہ آپ نے ہندی کیسے، کب، کس سے اور کیوں سیکھی؟"

میرے شوہر نے کہا کہ چھوڑیں جی، اس کا تو کام ہے، مختلف زبانیں سیکھتی رہتی ہے، مگر اس نے پھر پوچھا "لیکن یہ ہندی ہی کیوں؟"

شوہر نے کہا "دراصل یہ ٹیچر ہے۔"

مگر وہ قائل نہ ہوا، پھر اپنا سوال دہرا دیا۔ میں تو ڈر ہی گئی "یہ کیا؟ ایک پل میں میری ملک سے وفاداری مشکوک ہو گئی؟" میرا وہاں سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ آخر میں نے سوچ کر کہا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ جس کسی نے کسی قوم کی زبان سیکھ لی وہ اس کے شر سے محفوظ ہو گیا۔

اب وہ کچھ نرم ہوا، اس کے چہرے کے تاثرات کچھ بدلے، میں نے مزید کہا "دشمن کی زبان سیکھنی چاہیئے تا کہ پتہ رہے کہ دشمن کیا کر رہا ہے۔" اور دکان سے باہر آ گئی، مگر وہ سین آج تک ذہن سے نہیں اترتا جب میں علم کے شوق میں مشکوک ٹھہرائی گئی تھی۔

پھر کبھی دوبارہ میں نے اُس دکان میں قدم نہیں رکھا۔

ڈاکٹر خورشید نسرین، ادبی دنیا میں امواج الساحل کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ قطر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں، عربی شاعری ان کا میدان سخن ہے، سب سے پہلے انکی رباعیاں قطر میں چھپیں، عرب شاعری کو ہائیکو سے روشناس کرایا، عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں افسانے ترجمہ کئے، اپنے بھی دونوں زبانوں میں لکھے، عربی شاعری کا اردو شاعری میں اور اردو شاعری کا عربی شاعری میں بھی ترجمہ کیا۔ "ارمغانِ ابتسام" میں مستقل لکھتی ہیں۔

م۔ص۔ایمن

پہاجی

آپ کی آمد کا بے حد شکریہ!۔

صاحبو!کسی کے مرنے پر ہنسا گرچہ معیوب سی بات ہے لیکن تاریخ میں یہ موجود ہے کہ سید ضمیر جعفری کی پہلی برسی کے موقع پر جو تقریب منعقد کی گئی تھی تو اس میں بھی ضمیر جعفری کو ہنستے مسکراتے یاد کیا گیا تھا۔ان کی ان باتوں کو،ان جملوں کو دہرایا گیا تھا جن سے کسی کے لبوں پر مسکان کھیل جاتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے اپنا مضمون سنایا تھا جو تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ضمیر جعفری کے صاحبزادے جو اس وقت میجر تھے، میجر احتشام نے کہا تھا کہ یہ پہلی تعزیتی تقریب ہے،جس میں قہقہے بلند ہوئے ہیں۔

ابن انشا نے نثر میں طنزومزاح اور شاعری میں سنجیدگی کو اپنایا ہے۔بزم ظرافت کی جانب سے منعقدہ یہ تقریب...... ہے تو ابن انشا کی یاد میں لیکن اس میں قہقہہ لگانے پر پابندی نہیں ہے۔اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ہم ابن انشا کی یاد میں اس تقریب میں بھی ہنستے رہے ہیں تو ان کے جواب میں ایک خصوصی مضمون لکھا ہے۔یہ تین چار واقعات حقیقی ہیں ان میں بھی موت،میت،لاش،جنازہ،کفن دفن کا ذکر ہے۔تاکہ ہم موت کو نہ بھولیں اور یقین رکھیں کہ بڑے بڑے پھنے خان، نمرود وشداد وفرعون اس سے نہیں بچ سکے تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ہمیں بھی اس سفر پر جانا ہے۔یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل تمھاری باری ہے

(۱۱رجنوری ۲۰۱۹ء منفرد مزاح نگار ابن انشا کی اکتالیسویں برسی کے موقع پر منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)

۱۹۷۶ء کی بات ہے، میں پاکستان آرمی میں بطور درزی بھرتی ہوا تھا۔''ٹیلر شاپ'' میں پہنچا تو وہاں جن درزیوں سے واسطہ پڑا ان میں ''چنن دین'' نام کے ایک سفید ریش درزی سے بھی تعارف ہوا۔بزرگی کے لحاظ سے سب لوگ انہیں پہاجی! (بھائی جان) کہا کرتے تھے۔انہیں جب میرے بارے میں معلوم ہوا کہ میں وزیرزادہ ہوں (میرے والد کا نام وزیر محمد ہے) تو انہوں نے بھی کرید کرید کر مجھ سے میرے گھر کا،عزیزوں کا احوال معلوم کیا اور یہ بھی بتایا کہ جب میرے والد کی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی اس بارات میں شامل تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ رشتے میں وہ ہماری والدہ کے خالو تھے۔یعنی

ہمارے نانا ہوئے۔ میں نے انہیں بابا کہنا شروع کر دیا۔ ہمارا اُن کے ہاں آنا جانا نہیں تھا۔ وجہ مسلکی تھی۔ یوں رشتہ داری کے باوجود بھی خاندانی تعلقات قطع ہی تھے۔

رفتہ رفتہ پرانے درزی اپنی ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہوتے گئے۔ ایک فدا حسین ہوا کرتے تھے، وہ بھی اور پہاجی بھی ریٹائر ہو گئے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ پہاجی کا جوان بیٹا ٹرین سے کٹ کر جاں بحق ہو گیا ہے۔ وہ اور فدا حسین، شاہ فیصل کالونی میں رہتے تھے۔ ہم تمام لوگوں نے باجماعت پہاجی کے ہاں جانے کا ارادہ کیا۔ فدا حسین کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ فدا صاحب سے بھی ملتے چلیں۔ جب انہیں یہ خبر سنائی تو بولے کہ "ہاں مسجد میں اعلان ہوا، میں نے سنا تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ ہمارے پہاجی کا لڑکا ہے نہیں تو میں کل جنازے میں بھی شریک ہو جاتا۔"

وہ اسی وقت ہمارے ساتھ چل دیئے۔

پہاجی نے ہمیں دیکھا تو ان کے ضبط کے بندھ ٹوٹ گئے۔ میرے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ بیٹے سے جب ٹرین ٹکرائی تو اس کے جسم کے ٹکڑے دور تک بکھر گئے۔ اس کے گوشت کے لوتھڑے ریل کی پٹڑیوں سے چن چن کر شاپنگ بیگ میں بھر کر دفنائے گئے ہیں۔ بہرکیف کچھ دیر مرحوم کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ پھر بابا اور ان کے پرانے ساتھیوں کا آپس میں حال احوال معلوم کرنے کا تبادلہ ہوا۔ پہاجی نے بتایا کہ ایک تو ہمارا جوان بیٹا حادثے کا شکار گیا دوسرے ہمارے گھر ایک دراز میں کمیٹی کی جمع رقم چالیس ہزار روپے پڑی ہوئی تھی۔ جس کی کمیٹی تھی، اُسے آج پچاس ہزار روپے پورے کر کے دینے تھے، وہ کسی نے نکال لیئے۔ اس واقعے پر پھر سب نے افسوس اور مذمت کا اظہار کیا کہ میت کے گھر میں بھی میت کے موجود ہوتے ہوئے بھی لوگوں کو عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ماحول کتنا افسردہ ہے۔

کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر فدا حسین سے پہاجی نے پوچھا "سنا فدا حسین! کیا کر رہے ہو آج کل؟"

وہ بولے ''اللہ ہی اللہ ہے پہاجی! اب کچھ نہیں ہوتا۔ اِسی لئے گورنمنٹ نے بھی کہہ دیا تھا کہ تو ہمارے کام کا نہیں رہا۔ جا بابا اپنا کام کر!''

پہاجی نے پوچھا ''وہ جو ایک کمپنی میں پارٹ ٹائم پر جاتے تھے، درزی کا کام کرنے؟''

''نہیں پہاجی! وہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ سوئی میں دھاگہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ چار چار سوئیاں اور چار چار دھاگے نظر آتے ہیں، سمجھ ہی نہیں آتی کہ کون سا دھاگا کون سی سوئی میں ڈالنا ہے۔''

اِس بات پر جو قہقہے بلند ہوئے تو تعزیت کے لیئے آئے ہوئے دیگر افراد پہاجی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ کل اس بابا کا جوان بیٹا مرگِ ناگہانی سے چلا گیا ہے اور یہ آج ہی کھل کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔

ہمارا ایک دوست ہے توفیق! توفیق ان لوگوں میں سے ہے جو رنج و غم کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ نتیجے کے طور پر اپنی عمر سے آدھے دکھائی دیتے ہیں۔ غم واندوہ کے مارے لوگوں کو ہنسانا انہی لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ کسی کی موت پر خوش نہیں ہوتے۔ سوگ منانے والوں سے ان کا سوال یہ ہوتا ہے کہ ''نہ مرتا تو کیا کرتا'' غالب کی زبان میں کہتے ہیں کہ ''دوسرے کے مرنے پر غمگین وہ ہو جسے خود نہ مرنا ہو''۔

جمیل بھائی عرصے سے ہمارے محلے کے رہائشی تھے۔ ان کے والد صدر میں رہتے تھے۔ خبر ملی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے قریبی پڑوسی تعزیت کے لیے گئے۔ توفیق چونکہ ان کا کرایہ دار تھا کچھ نہ کچھ تعلق تو بنتا تھا، سو وہ بھی گیا۔ تعزیت گزار جو بھی آتا کمرے میں جا کر جمیل بھائی سے تعزیت کرتا اور صحن میں آ کر بیٹھ جاتا۔ توفیق نے بھی یہی کیا۔ جمیل بھائی کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر وہ بھی دیگر افراد کی طرح صحن میں آ بیٹھا۔ اس علاقے میں جمیل بھائی کے علاوہ اس کا شناسا کوئی نہ تھا۔ کوئی واقف نہ پا کر وہ وقت گزارنے باہر نکل آیا۔ ٹہلتے ہوئے اس نے اپنے پڑوسیوں شبیر اور غلام مصطفیٰ کو جمیل بھائی کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔

ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور احسان دانش اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر تاثیر کے ایک دوست اُسی ڈبے میں داخل ہوئے۔ تاثیر نے اُن سے احسان دانش کا تعارف کراتے ہوئے کہا ''آپ ہیں اُردو کے مشہور شاعر، مصورِ فطرت حضرت احسان دانش۔''

اُس نے پوچھا ''وہی جو مزدوروں کے بارے میں نظمیں لکھتے ہیں؟''

تاثیر نے کہا ''جی ہاں، وہی!''

وہ دوست کہنے لگا ''خدا کی قسم، اِن کی نظمیں پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ صبح اُٹھتے ہی ہر مزدور کے سر پر سو جوتے لگائے جائیں۔''

اس کی ڈھارس بندھی کہ چلو کوئی تو اپنا ملا۔ وہ دانستہ انہیں اتنا موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ بھی حسبِ دستور جمیل بھائی سے تعزیت کر کے صحن میں آ بیٹھیں۔ یوں وہ ٹہل قدمی کرتا واپس آ گیا۔ جب وہ جمیل بھائی کے گھر دوبارہ داخل ہوا تو حسبِ توقع وحسبِ منشا وہ دونوں صحن میں دیگر افراد سے الگ تھلگ خاموش بیٹھے تھے۔ توفیق جیسے مسئلے سے وہ بھی دوچار تھے۔ توفیق کو اپنے سامنے پا کر وہ کھل اٹھے کہ ''چلو بوریت کٹے گی''۔ توفیق بھی ان سے مصافحہ کر کے ان کے قریب بیٹھ گیا۔

''جاؤ جا کر تعزیت کر آؤ۔۔۔ پھر آ کر باہر بیٹھنا!'' غلام مصطفیٰ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ توفیق ابھی آیا ہے۔ اس نے سرگوشی میں توفیق کو تعزیت کے آداب سکھانے کی کوشش کی۔

''کیسے کرتے ہیں؟'' توفیق نے اسی سرگوشی میں پوچھا۔

''جمیل بھائی کمرے میں ہیں۔ ان سے کہہ دینا کہ اللہ آپ کو صبر دے۔ آپ کے والد کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے میں میت کے سامنے جھوٹ بولوں؟'' توفیق نے اسے گھورا

''جھوٹ کیا؟ سب ایسے ہی بولتے ہیں ناں یار!'' غلام مصطفیٰ گڑبڑا گیا۔

''ایمانداری کی بات ہے! مجھے تو بالکل بھی افسوس نہیں ہوا۔ مرنا تو سب کو ہے اور زندگی و موت دینے والا اللہ ہے۔ افسوس کے اظہار کا مطلب ہے کہ ہمیں اس کی قدرتی موت پسند نہیں ہے!!'' توفیق نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یار سب ایسے ہی کہتے ہیں۔'' غلام مصطفیٰ نے پھر سرگوشی کی۔

''کوئی حادثہ ہوتا ہے۔۔۔ کوئی جوان آدمی اچانک مر جائے جس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔۔۔ جوان بیوہ ہو جائے! اس کے لیے افسوس کیا جا سکتا ہے لیکن یار! یہ نوے سال کا بوڑھا اپنی زندگی گزار گیا۔ اپنے سارے بیٹے بیٹیاں ٹھکانے لگا گیا۔ اس کے پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کی بھی شادیاں ہو گئی ہیں۔۔۔ اب بھی نہ مرتا؟'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا استفہام تھا کہ ''نہ مرتا تو کیا کرتا''

''کھی ای ای ای'' کر کے شبیر اور غلام مصطفیٰ کی بے ساختہ ہنسی بلند ہوئی تو دیگر افراد نے ان کی جانب مڑ کر دیکھا۔ یہ دونوں جھینپ گئے کہ میت کے گھر آئے ہوئے ہیں۔

''یار! یہ باتیں بعد میں کر لیں گے۔ پہلے تو جا! جا کر جمیل بھائی سے تعزیت کر آ۔۔۔'' غلام مصطفیٰ نے سرگوشی کرتے اسے کہنی سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

''نہیں یار! جو شخص میرے مرنے پر خوش ہو میں اس کے مرنے پر افسوس کیسے کروں؟ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔''

''یار تیرے مرنے پر وہ کیسے خوش ہوگا؟ وہ تو مر گیا'' مصطفیٰ نے جبڑا بھینچتے ہوئے ہنسی گلے میں دبوچ لی۔

''ایک بات تو بتاؤ؟۔۔۔ تم کسی دوسرے شہر میں جاؤ، وہاں اپنا کوئی جاننے والا اچانک مل جائے تو کیسا محسوس کرتے ہو؟'' توفیق نے پوچھا۔

''ہمیں خوشی ہوتی ہے!'' مصطفیٰ بولا۔

''خوشی ہوتی ہے ناں؟'' توفیق نے اسے مزید پکا کیا۔

''ہاں اور کیا!''

''دیکھو! یہ مر کر اللہ کے پاس چلا جب میں مروں گا تو میں بھی اللہ کے پاس جاؤں گا۔ یہ مجھے وہاں دیکھے گا تو خوش ہوگا کہ نہیں؟''

''ہاں یار یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو!''

''تو تم خود ہی بتاؤ کہ ایسے شخص کے مرنے پر میں افسوس کروں جو میرے مرنے پر خوش ہو؟'' توفیق نے کہا تو مصطفیٰ نے بمشکل ہنسی روکی جبکہ شبیر نے ناک کے نیچے ہتھیلی یوں رکھ رکھی تھی گویا منہ سے ہاتھ ہٹایا تو اس کے منہ میں کڑوی دوا ڈال دی جائے گی۔

''آیا کس لیئے ہے تو! یہ تو رسم ہے۔ کسی کے افسوس کرنے سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن جسے افسوس نہیں ہوتا وہ بھی ایسے ہی کہتے ہیں۔ تو جا۔ کچھ مت کہنا۔ جمیل بھائی سے ہاتھ ملا کر آ جا!''

توفیق اٹھ کھڑا ہوا۔ دو قدم چل کر پھر مڑا ''یہ اتنا بڑا صحن ہے۔ چھوٹا سا کمرہ ہے تو میت انہوں نے کمرے میں کیوں رکھی ہوئی ہے؟ باہر رکھتے ناں!!'' توفیق نے غلام مصطفیٰ سے یوں کہا گویا اس میں بھی اسی کا قصور ہو۔

''عورتوں کی وجہ سے انہوں نے میت کمرے میں رکھی ہے۔ اندر ایک طرف عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں اور دوسری طرف ان کے

دوسری جنگِ عظیم میں حفیظ جالندھری سانگ اینڈ پبلسٹی کے محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو ایک بے روزگار شاعر لکھنؤ سے حفیظ جالندھری کے پاس دہلی آئے۔ بولے ''خدا کا شکر ہے کہ آپ اِتنے بڑے عہدے پر فائز ہوئے ہیں۔ میں مدت سے بے روزگار ہوں، مجھے ملازمت درکار ہے۔''

''یہاں ملازمت کے لئے گریجویٹ ہونا ضروری ہے، آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟'' حفیظ جالندھری نے سوال کیا۔

''جی میں انڈر میٹرک ہوں۔'' شاعر نے جواب دیا۔

''بھائی یہاں انڈر میٹرک کے لئے تو بس ایک ہی ملازمت ہے۔'' حفیظ صاحب بات پوری بھی نہ کر پائے تھے کہ وہ صاحب کہنے لگے ''وہی دلوا دیجئے!''

یہ سُن کر حفیظ صاحب اپنی کرسی خالی کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''آپ اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں کیونکہ میں خود بھی انڈر میٹرک ہوں۔''

خاص خاص قریبی عزیز! باہر سب ملنے جلنے والے ہیں۔ یہ سب تعزیت کر آئے ہیں۔'' غلام مصطفیٰ نے وضاحت کی۔

''اندر عورتیں بھی ہیں؟'' توفیق سراسیمہ ہوا۔

''ہاں۔۔۔!!'' غلام مصطفیٰ بولا۔

توفیق پھران کے قریب بیٹھ گیا'' نہیں یار! پرائی عورتوں کے سامنے میں نہیں جاتا۔''

''اوہ! جا یار! جمیل بھائی دروازے کے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے دو چار الفاظ بول کر، اپنی شکل دکھا کر آجا۔'' اس نے کنایۂ تعزیت کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ توفیق طوعاً و کرہاً اٹھا اور دو قدم چل کر پھر پلٹ آیا۔

''اب کیا ہوا؟'' غلام مصطفیٰ نے حتی الامکان دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''یار مصطفیٰ۔۔۔'' اس نے سرگوشی کی ''رونا بھی پڑے گا؟''

غلام مصطفیٰ اور شبیر کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سب نے انہیں مڑ کر دیکھا کہ یہ میت کے گھر آئے ہوئے ہیں یا کسی تفریح پر! غلام مصطفیٰ اپنی ہتھیلی سے چہرہ ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے یکلخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا ''اوئے وہ تیرا ماما نہیں لگتا کہ رو کر تعزیت کرے۔''

''تو پھر کیا فائدہ!'' یہ کہہ کر وہ پھران کے قریب بیٹھ گیا۔

غلام مصطفیٰ کو غصہ آنے لگا تھا کہ توفیق کی وجہ سے سوگوار ماحول میں بھی اس کی ہنسی نکل گئی تھی اور بعد میں یہ غصہ اور بھی بڑھ گیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ توفیق انہیں بے وقوف بنا رہا تھا اصل میں وہ ان کے آنے سے پہلے آیا تھا اور تعزیت کر چکا تھا۔

گھر میں دو بہنیں ہوں تو ان کی لڑائی عجیب ہی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے ضد لگی رہتی ہے۔ ناشتے کے برتن صبح سے پڑے رہیں گے۔ ایک کہے گی ''میں نے ناشتہ بنایا ہے برتن یہ دھوئے گی۔'' دوسری کہتی ہے ''میں نے آٹا گوندھا ہے۔ برتن یہ دھوئے گی۔ میں نے جھاڑو دی ہے کپڑے دھونے کی باری اس کی ہے۔'' یہ ضد بڑھتے بڑھتے اکثر حد سے گزر جاتی ہے۔ اسی طرح ایک گھر میں دو بہنیں تھیں۔ دونوں میں یہ پرخاش چلتی رہتی تھی۔

ایک اگر کوئی بات کرتی تو دوسری کا فرض تھا کہ اسے ضرور ٹوکے اور اسے بتائے کہ اس سے شدید حماقت سرزد ہوئی ہے۔ ان کے ابا کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ سب ہی رو رہے تھے۔ روتے روتے چپ ہوجاتے، جب کوئی نیا سوگوار آتا تو بین کا نیا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ رشتہ دار معمر خواتین بین کرتے ہوئے ایک ہی لے میں بہت کچھ کہہ جاتیں۔ ایک معمر خاتون نے مرنے والے کے ہاتھ اہم پیغام بھیجنے کی کوشش کی ''بچہ بچہ! تو جہاں جا رہا ہے میرا بھائی بھی گیا ہوا ہے۔ میرے بھائی سے ملنا۔۔۔ اس سے میرا سلام کہنا۔۔۔ اور کہنا مجھے تیری یاد بہت آتی ہے۔''

مرحوم کی بڑی بیٹی نے سنا تو اس نے بھی پیغام دیا۔ ''ابا ابا!۔ دادی سے ضرور ملے گا تو۔ دادی کو میرا اسلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ تیری پھپو تجھے بہت یاد کرتی ہے۔''

چھوٹی بیٹی بولی ''ابا! تو کام سے آ رہا تھا۔۔۔ تیرا ایس کی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ تو سارے دن کا تھکا ہوا تھا۔۔۔ کہیں نہیں جانا بس آرام کرنا۔''

ایک دوست کا انتقال ہوا۔ جنازہ تیار تھا، اٹھا کر مسجد تک جانا تھا۔ میں میت کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اندر سے بین کی آوازیں آ رہی تھیں۔

گھر سے تازہ تازہ بیوہ ہونے والی خاتون کا بین سنائی دیا ''ہائے میرا ایک ہی شوہر تھا!''

مرحوم کی ایک بیٹی کا بین سنائی دیا ''ہائے ہمارا ایک ہی ابو تھا!!''

م۔ص۔ ایمن کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے معیاری رسائل میں ان کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔ ''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے۔ بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ اندازِ بیان میں شگفتگی اور شائستگی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

قندِ شیریں

کائنات بشیر، جرمنی

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

زندگی ایک خوبصورت تحفہ ہے تو دنیا ایک بازار، بھریا میلہ۔۔۔۔۔جہاں تماشا بھی ہے اور تماشائی بھی، کھیل کھیلنے والے بھی ہیں اور دیکھنے والے بھی، سب اسی تھیٹر کے بلامعاوضہ کردار ہیں۔ جو کبھی سٹیج پر آتے ہیں۔ کبھی تماشائیوں کی صف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تھیٹر کا پردہ لہراتا رہتا ہے اور تماشائے اہل کرم دیکھتے رہتے ہیں۔

ایشیائیوں کی یہ خاص عادت ہے کہ وہ اپنی روایات، کلچر، رسم وروج کے بہت پاسدار ہیں۔ بھئی ہونا بھی چاہیئے۔ انٹلیکچو ئیل۔!

ہم چلے تو ہمارے سنگ سنگ نظارے چلے

سو ہم ایشیائی لوگ جہاں بھی جاتے ہیں اس دولت کو ایک گٹھڑی میں باندھ کر زادِراہ کے طور ساتھ لے جاتے ہیں۔ جب یہی چیزیں بیرون ممالک ایک نئے ماحول، نئے کلچر میں پہنچ جاتی ہیں تو وہاں ایک نئے روپ میں سامنے آ کر دل لگی کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس لیے زمانے اور وقت کی یاری کا ساتھ دینا بہت ضروری ہے۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے بڑے آرام سے کچن کو باور چی

خانہ کہہ لیا جاتا تھا۔ کھانے کے کمرے کا تصور خال خال تھا۔ افراد خانہ باورچی خانے میں چولہے کے اردگرد چوکی یا پھر نماز پڑھنے والے تخت یا فرشی دستر خوان پر جمع ہو جاتے۔ ڈرائنگ روم کو بیٹھک کہہ لیا جاتا۔۔ اور واللہ بیڈ روم تو تھے ہی نہیں۔ صحن، برآمدے، چھتیں، سونے کے لیے اتنے ذرائع بندے کے پاس ہوا کرتے کہ جہاں دل چاہا کھٹیا ڈال لی اور لگے خراٹے لینے۔۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ کمرے کو سونے کا کمرا کہہ لیا جاتا جو دن بھر ہجر میں مبتلا رہتا اور سونے والوں کو صرف رات میں یاد آتا۔ پھر احباب باتھ روم کو غسل خانہ کہتے جو کسی آلتو فالتو چیز کی طرح گھر کے کسی کونے میں بنا دیا جاتا اور اس سے بھی ہٹ کر گھر کے کسی خفیہ کونے میں بنا دیا جاتا۔۔ حاجت خانہ۔۔ بلکہ سننے میں آیا ہے کہ گھر کی زینت برقرار رکھتے ہوئے کئی گھروں میں اسے چھت پر بنا دیا جاتا تھا۔ لوگ شرماتے شرماتے دوسروں سے نظریں بچا کر سیڑھیاں چڑھ کر اس میں جا کر چھپ جایا کرتے تھے۔ ویسے انگریزوں کی انگریزی کے طفیل بعد میں اس کو کئی نام مل گئے۔ ٹوائلٹ، لیٹرین، واش روم اور نہ جانے کیا کیا۔۔!

حاجت خانہ۔۔۔ ریلوے اسٹیشن پر بھی موجود ہوتا۔۔۔ اوئی اللہ، بغیر کسی شرم و حیا کے کھلے عام دو چھوٹے چھوٹے ڈربہ نما کمرے بنے نظر آتے جو راہ چلتے مسافروں کو اپنی اور بلاتے۔۔۔ جنہیں ادھر نہ بھی جانا ہوتا وہ بھی اسے دیکھ کر خوامخواہ ادھر کو لپک جاتے۔ ان پر لکھا ہوتا۔ مردوں کے لیے ٹائیلٹ اور عورتوں کے لیے خاص ٹائیلٹ۔۔ پھر بھی کہیں کوئی مسافر مغالطہ نہ کھا جائے اور ایک دوسرے کے حصے میں گھس کر شرم سے پانی پانی نہ ہو جائے، ان پر کسی مرد کا کارٹون اور عورت کی برقعہ نما تصویر ٹانک دی جاتی۔ مرد اپنے حصے میں بے دریغ گھسے چلے جاتے جبکہ عورتیں شرماتی لجاتی پہلے اِدھر اُدھر دیکھتیں پھر غڑاپ سے اندر داخل ہو جاتیں۔

زمانے کی تیزی نے رسم و رواج کی طرح لوگوں کے رہنے سہنے کے طریق کار کو بھی بدل ڈالا۔ صحن اور چھتیں چوروں نے بند کروا دیں۔ خوبصورت اور سہولتوں سے بھرپور کچن بن گئے۔ امارتی اشیاء سے ڈرائنگ روم سج گئے۔ لمبی لمبی میزوں، آرام دہ کرسیوں سے آراستہ ڈائننگ روم، چمچماتے باتھ روم، آسائش سے بھرپور بیڈ روم، بچوں کے خوبصورت فرنیچر سے آراستہ چلڈرن روم لوگوں کی زندگیوں میں بے تکلفی سے چلے آئے۔ غسل خانہ اور حاجت خانہ۔۔ حاجت رکھتے ہوئے بھی غائب ہو گئے۔ پر حقیقت میں وہ ایک گھر میں کئی کئی کے تناسب سے بیڈ روم سے منسلک ہو کر اپنا نام و مکاں بدل گئے۔ اب انھیں۔۔ اٹیچ باتھ روم۔۔ کہا جانے لگا اور ''ٹو ان ون'' کے مصداق لوگوں کی زندگیوں کا اچھا خاصا وقت وہاں گزرنے لگا۔ جہاں فراغت بھی تھی اور مصروفیت بھی۔۔!

اس سب کے باوجود کچھ لوگ اپنی پرانی روایات سے کمبل کی طرح چمٹ چکے ہیں۔ لائف بوائے سے نہانے والے اور تبت سنو کریم لگانے والے کرم فرما جب ولایت پہنچ گئے تو وہاں جا کر انگریزوں کو بھی اپنے رنگ ڈھنگ دکھا دیئے۔ میں نے انگلینڈ

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے، اِس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب ''ولایت پاس'' ہو کر آئے۔ ریاست میں کوئی اسامی نہ تھی جو ان کو دی جا سکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے، راجہ صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کر آئے ہیں، راجہ صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہلچل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے۔ یہ ان کی جگہ پر تعینات کر دیئے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینئر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ اُن کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

چارپائی از رشید احمد صدیقی

سنو کریم لگانے والے کرم فرما جب ولایت پہنچ گئے تو وہاں جا کر انگریزوں کو بھی اپنے رنگ ڈھنگ دکھا دیئے۔ میں نے انگلینڈ کے کئی گھروں میں دو دو حاجت خانے دیکھے۔ ایک تو باتھ روم کہلاتا۔ جس میں چم چم کرتا باتھ ٹب اور دوسرے کونے میں تن من پر بارش کی طرح برستا شاور نظر آتا۔ لشک لشک کرتے واش بیسن اور جدید کموڈ نے غسل خانے کو نئی شکل دے دی۔۔ جس میں شمپو، کنڈیشنر، مختلف کریمیں، سپرے، لوشن اور پرفیوم سجے ہوتے اور کچھ سر سبز پودے بھی تر و تازگی کا احساس دلاتے۔ اس آماجگاہ کو احباب گھر کے باقی حصوں کی طرح خوب صاف ستھرا سجا بنا رکھتے۔ آنے والے مہمان اور ملنے والے بھی بے تکلفی سے اس میں آتے جاتے رہتے۔ جس کی گھر والوں کو چنداں پرواہ اور فکر نہ ہوتی۔

لیکن کچھ گھروں کے ایک خفیہ کونے میں ایک چھوٹا سا ڈربہ نما کمرا نما جیسی چیز ہوتی۔ جسے آئے گئے ملنے ملانے والے اور مہمانوں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی۔ اگر کوئی اس کے بارے میں بر سبیل تذکرہ پوچھ لیتا یا اسے دیکھنے کے لیے اندر جانے کی کوشش کرتا تو اسے آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا جاتا۔ سوال کرنے والے کی توجہ کسی اور طرف مبذول کر دی جاتی۔ یا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جدید باتھ روم میں لے جا کر چھوڑ دیا جاتا۔ پر سوئے اتفاق ایک بار انگلینڈ کچھ عرصہ رہنے پر یہ بات کھل گئی۔ اور وہ راز۔۔۔ راز نہ رہا۔

ایک بار کسی گھر میں میزبان کی منع کرتی کوشش کے دوران ہم تیزی سے اس ڈربہ نما کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانک چکے تھے۔ میزبان کا چہرہ اُتر گیا اور ہمارا رنگ اڑ گیا۔ ایک لمحے کو تو لگا کہ ہم انگلینڈ کی بجائے سرزمین وطن پر ہی کھڑے ہیں لیکن پھر ہم مسکرا دیئے۔ اندر خالص پاکستانی۔۔ حاجت خانہ۔۔ موجود تھا۔ کموڈ کی بجائے زمین پر دو اینٹوں والا فلش سسٹم موجود تھا۔ جس کے اوپر پانی کی ٹینکی بھی لوہے کی کھینچنے والی زنجیر کے ساتھ نمایاں تھی۔ (اسے دیکھ ہمیں عدل جہانگیر زنجیر یاد آ جاتی۔) پاس ہی ایک سلور کا لوٹا بھی مُہر کی طرح دھرا تھا۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے

> یو پی کے لفٹنٹ گورنر علی گڑھ کے کالج میں مہمان تھے۔ رات کے کھانے میں مجھ جیسے ایک گنوار نے میز پر زور سے ڈکار لے لی۔ سب جنٹلمین اُس بیچاری دہقانی کو نفرت سے دیکھنے لگے، برابر ایک شوخ وطرار فیشن ایبل تشریف فرما تھے۔ انہوں نے نظرِ حقارت سے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ جیب سے گھڑی نکالی اور اس کو بغور دیکھنے لگے۔ غریب ڈکاری پہلے ہی گھبرا گیا تھا۔ مجمع کی حالت میں متاثر ہو رہا تھا۔ برابر میں گھڑی دیکھی گئی تو اس نے بے اختیار ہو کر سوال کیا" جناب کیا وقت ہے؟"
> شریر فیشن پرست بولا" گھڑی شاید غلط ہے، اس میں نو بجے ہیں۔ مگر وقت بارہ بجے کا ہے کیونکہ ابھی توپ کی آواز آئی تھی۔"
> بیچارہ ڈکار لینے والا سن کر پانی پانی ہو گیا کہ اس کی ڈکار کو توپ سے تشبیہ دی گئی۔
> "پیاری ڈکار" از" خواجہ حسن نظامی"

کہ پاکستان میں کموڈ سسٹم گوروں نے ایجاد کیا ہے لیکن گورے کب اس پاکستانی سسٹم کو اپنے ہاں درآمد کر چکے واللہ، یہ ہم قطعانہ جانتے تھے۔ گوروں کی زمین پر ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملے گا اس کے لیے ہم ہرگز ہرگز تیار نہ تھے۔ تبھی مختلف گھروں میں وہ چُھپا چھپا شرمایا شرمایا سا کونا اور میزبانوں کا اس سے توجہ ہٹوا دینا، سب سمجھ میں آ گیا اور من میں جلترنگ بجنے لگے۔۔۔ ہم مسکراتی نظروں سے میزبان کو دیکھنے لگے ۔

ہم جان گئے سرکار تم لاکھ کرو انکار
تم لاکھ بنو ہوشیار کرتی ہے نظر اقرار

آخر میزبان جھینپ کر ہنس پڑی اور کہنے لگی "نہیں دراصل وہ بات یہ ہے کہ ہم تو اسے استعمال نہیں کرتے۔ یہ تو گھر میں بزرگوں کے لیے ہے یا پھر پاکستان سے گاؤں سے آئے مہمانوں کے لیے۔۔۔ انہیں یہاں کے کموڈ سسٹم کی عادت نہیں ہے ناں۔"

"اچھا، بالکل جی بالکل، پردیس میں اگر دیس کے رنگ

دیکھنے کو مل جائیں تو کیا ہی بات ہے۔‘‘ ہم نے بھی فوراً بے نیازی کی چادر اوڑھ لی۔ لیکن یہ رنگ ہمارے ساتھ چلا آئے گا اور ہمیں کسی اور پڑاؤ پر ملے گا اس کا بالکل اندازہ نہ تھا۔

جرمنی۔۔۔

ہٹلر کا دیس۔۔۔

نازیوں کا مسکن۔۔۔

یورپ کا ایک خوبصورت ملک۔۔۔!

جو معاشی ترقی کے لحاظ سے یورپی اقوام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفائی میں بے مثال، نئی لِشک لِشک کرتی گاڑیاں، جرمنوں کے ذاتی خوبصورت گھر، بش، زیمنس، جیسی بڑی بڑی کمپنیاں، یہاں ایشین کمیونٹی بہت کم، جرمنوں کا دبدبہ اور نخرے۔ سو اتنے مخصوص ماحول میں رہتے ہوئے بندہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایشیائی لوگ یہاں بھی اپنے جی کی کریں گے۔

ایک پاکستانی فیملی نے اپنا گھر فروخت کیا، جسے مسلم کمیونٹی نے خرید کر وہاں ایک مسجد بنا دی اور لوگ اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ سہولت میسر ہوئی تو پاکستانی خواتین بھی وہاں جمع ہو کر درس قرآن کرنے لگیں۔ ایک بار اسی درس قرآن کے موقع پر ایک خاتون کے ساتھ اس کی دوست بھی ساتھ چلی آئیں جو ملک یمن سے تھیں۔ جن کے ہمراہ دو بچے تھے۔ درس کے دوران بچے نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ ٹوائلٹ جانا چاہتا ہے۔ اس کی ماں نے دوسری خواتین سے پوچھ کر بچے کو ٹائلٹ روم جانے تک کا راستہ سمجھا دیا۔ بچہ چلا گیا تو ماں پھر درس سننے میں مگن ہو گئیں۔ کافی دیر ہو گئی تو ان کی دوست نے انھیں یاد دلایا کہ بچہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

’’اوہ‘‘ کہہ کر ماں اٹھی تو ان کی دوست بھی ساتھ اٹھ کر چل دی۔ وہاں جا کر ٹوائلٹ روم کے دروازے پر دستک دی اور ساتھ ہی دروازہ کھول دیا۔ تو ایک نظارہ برپا تھا۔۔ اندر وہی، خالص پاکستانی سٹائل والا دو اینٹوں والا فلش سسٹم موجود تھا اور وہ سات آٹھ سالہ بچہ اپنے جسم کو پورے کپڑوں سے آزاد کیے فلش کے پاس کھڑا اسے بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے کیسے استعمال کیا جائے۔۔؟

وہ خاتون بچاری بہت شرمندہ ہوئیں۔ جس نے بھی سنا اس واقعے سے خوب لطف اٹھایا۔۔ اب یمن والے کیا جانیں پاکستانی رنگ ڈھنگ۔۔!

روایات پسند ہونا اچھا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ حد سے بڑھ جائے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے سفرنامہ ’’خانہ بدوش‘‘ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جیسے ہی وہ جھیل لوگا نو دیکھ کر اپنی کیمپنگ کی طرف واپس آنے کے لیے ایک سڑک پر چلتے ہیں تو اچانک منظر بدل جاتا ہے۔ آس پاس گزرتی گاڑیوں کے ڈرائیور انھیں دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگتے ہیں۔ ہارن بجنے لگتے ہیں۔ اس پر انہیں لگتا ہے کہ شائد یہ لوگ بھی ان کی شہرت سے آگاہ ہیں اس لیے خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کہ اتنے میں ایک سکوٹر سوار لڑکی پاس سے گزرتے ہوئے کہتی ہے ’’یہ سلیپنگ سوٹ بہت شاندار ہے۔‘‘ تب وہ اپنے لباس پر نظر ڈالتے ہیں۔۔۔ کڑھا ہوا بوسکی کا کُرتہ اور لٹھے کی شلوار‘‘

ہم تو بہر حال یہی کہیں گے اپنے کلچر اور ریت رواج کو ضرور یاد رکھیں۔ نسل در نسل منتقل بھی کریں لیکن کوشش کریں کہ انھیں وہیں نبھائیں جہاں ان کی اصل ضرورت ہے۔ ان کی بدولت کسی دوسرے کو خواہ مخواہ تکلیف یا کوفت کا سامنا نہ ہو اور خود بھی رنگِ محفل نہ بن جائیں۔

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔ شگفتہ نگاری اِن کی تحریر کا خاصا ہے۔ اندازِ تحریر میں بے تکلفی، بیساختگی اور جامعیت ان کی تحریر میں خاصے تواتر سے دکھائی دیتی ہیں۔ خاصی تندہی سے لکھ رہی ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں اِن کی کتاب ’’چاند اور صحرا‘‘ شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ ’’ارمغانِ ابتسام‘‘ کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

کچھ اونگا بونگا ہو جائے

UC کے کرشمے

ابتدائی طور پر کل شام سے ہمارے برابر میں چیپس ڈیپارٹمینٹل اسٹور کی دکان کھلی ہے اور مین گٹر بلاک ہو گیا۔ میں نے فلیٹ یونین سے رابطہ کیا تو ایم کیو ایم کے صدر کو نکال دیا گیا جب میں ملایشیا میں تھا۔ غبن وغیرہ کے الزامات تھے۔ گٹر ریورس ہوا اور سارے گھر میں اوپری فلورز کا پانی قدرتی والا اور لہسن قدرتی والا تیر رہا ہے۔ میں نے اسے پراجیکٹ میں ڈیڈ لاک سمجھا اور فوراً جمعدار کو فون کھڑکایا تو اس نے کہا کہ وہ اتوار کو بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور وہ بھی ایم کیو ایم کی وجہ سے ہم سب سے کٹی ہے۔ میں نے عقاب کی طرح برابر والے اسکوئیر کے جمعدار کو پکڑا تو اس نے کہا آپ جیسے محنتی شخص کے کہنے سے میں آپکے ایم کیو ایم کے صدر کے حکم کے برخلاف تو کرنے سے رہا۔ سو میں نے چوکیدار کو فون کھڑکھایا اور ملا بھی لیکن وہ بھی ساتھی نکلا۔ اس نے کہا اب جائیں نہ ذرا کے ایم سی کی کوڑا صاف کرنے والی گاڑیوں کو پکڑیں وہ فری کام کر دیں گی۔ اس کو بھی صدر کے ساتھ نکالا گیا تھا، سو کل صبح تک اوپر والے جو کھائے پکیں گے مجھے پتہ ہو گا۔

بس کل سے بڑے پراجیکٹ پر کام شروع کروں گا ذرا یہ چھوٹا گٹر کھل جائے۔

بڑا آدمی

ہر جگہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور بڑے بن جاتے ہیں۔ ایک امروہہ ہی واحد جگہ ہے جہاں پیدا ہی بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں قصور جگہ کا نہیں امروہہ کے لوگوں کی نظر کا کمال ہے۔ اب

جان بھائی کو ہی دیکھ لیں۔ امروہہ کے لوگ تو رہتے ہی دھن میں ہیں، ایک دن جان جان بھائی کو اکڑوں بیٹھے دیکھا تو سمجھے کہ اکڑوں بیٹھ کر شاعری کر رہے ہیں۔ حالانکہ بچپن میں کھیل کود رہے تھے اور پچو کی پتھر اکڑوں بیٹھ کر ایک کے اوپر ایک رکھ رہے تھے تاکہ کرچچ کی بال سے نشانہ لگائیں۔ لیکن امروہہ کے لوگوں کی ضد تھی کہ اسطرح اکڑوں بیٹھنا صرف نایاب شاعر ہی کرتے ہیں۔ اب لوگوں نے شاعر سمجھ ہی لیا تو جان بھائی نے اپنے محلے کے سیکٹر انچارج سے مشورہ کیا کہ شعر کیسے نکالا جائے۔ وہ اکثر مخالفین کو اغواء کرتا اور چماٹ لگانے سے قبل بلا اختلاف جنس کہتا ؎

کتنی دلکش ہو تم، کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ تم لوگ مر جاؤ گے

یہ کہنے کے بعد سیکٹر انچارج منہ کھول کر ہنسا اور ایک چماٹ لگایا۔ بس کیا تھا یک دم جان بھائی کے سوئے ہوئے ذہن میں ایک چمک سے اٹھی اور تم لوگ مر جاؤ گے کی تصیح کی اور اپنا شعر بنا لیا ؎

کتنی دلکش ہو تم کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

رفتہ رفتہ جان بھائی کی دوستی سیکٹر انچارج سے بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دن وہ جان بھائی کو لائنز ایریا لے کر گیا اور اپنے دوست سے ملاقات کرائی۔ وہ کن کٹا تھا۔ وہ بھی ہر واردات سے پہلے گنگناتا تھا ؎

مجھے غرض ہے مری جان کاٹ کھانے سے
نہ تیرے آنے سے مطلب نہ تیرے جانے سے

جان بھائی کے لیے یہ دوستی گویا سونے کی کان ثابت ہو رہی تھی۔ انکو امید ہو چلی تھی کہ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو ایک دن وہ امروہہ والوں کے منہ پر پورا دیوان دے ماریں گے جنہوں نے بچپن میں انکی پچو باری چھڑا کر شاعری جیسے اوکھے کام پر لگا دیا۔ بہر حال جان بھائی نے اس شعر کو بھی تصیح کر کے اپنا بنا لیا ؎

مجھے غرض ہے مری جان غل مچانے سے
نہ تیرے آنے سے مطلب نہ تیرے جانے سے

امروہہ والے جان بھائی کے اس ہنر پر فریفتہ ہوئے چلے جارہے تھے اور جان بھائی نڈھال۔

ختنہ

امریکہ اور پاکستان میں فرق صرف ختنہ کا ہے۔ پاکستان کی اپنی پیدائش کے بعد ہی قرارداد مقاصد کے ذریعے آئینی ختنہ کرا لی جبکہ امریکہ بدستور اس عمدہ تحفے سے محروم ہے۔ امریکہ میں کاغذ کو لکھنے کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں صرف لکھنے کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے، طہارت اب بھی پانی ہی سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں بڑے بڑے ڈیم بنائے جاتے ہیں جبکہ امریکہ میں جنگلات لگائے جاتے ہیں جہاں آئے دن آگ لگی رہتی ہے اور کاغذ کی کمی رہتی ہے۔ امریکہ کے لوگ ۱۲ سال کی عمر سے بیوی کی تلاش شروع کر دیتے ہیں اور بالآخر ۳۶ سال کی عمر میں ایک بیوی مل ہی جاتی ہے جس کے بعد بھی بیوی کی تلاش جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی گورے رہتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں بیوی کی تلاش ۲۴ سال کی عمر سے شروع ہو کر ۲۴ سال اور ۲ مہینے میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کے سیاہ ہونے کا سبب تلاش کے بجائے اکتفاء کی عافیت میں پناہ حاصل کرنا ہے اور تلاش بھی پھپھو کرتی ہیں۔ پاکستانی بیوی کی ایٹم بم کی طرح حفاظت کرتے ہیں چاہے کتنی وار آن ٹیرران پر مسلط کی جائیں۔ امریکی کھانے میں پیزا اور پاکستانی کھانے میں تلی بریانی پسند کرتے ہیں اسی وجہ سے امریکی موٹے اور پاکستانی دبلے لیکن ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔

کوئٹہ عنابی ہوٹل

یہ کوئٹہ عنابی ہوٹل رائل ڈھاکہ والی گلی میں ہے؟

آپ کس طرف سے آئیں گے؟ اگر ائیرپورٹ کی سمت سے نیپا آرہے ہیں تو سرسید سے مڑ سکتے ہیں یا پھر نیپا کی طرف سے مڑ کر ائر و کلب۔ اگر سوک سینٹر سے آرہے ہیں تو صادقین سے ائرو کلب ورنہ سیدھا اردو کالج کے پل پر لے لیں پھر ائرو کلب۔ اگر ناگن چورنگی سے آرہے ہیں تو پہلے سہراب گوٹھ پھر گلشن چورنگی

آئے گا۔ وہاں سے ڈھاکہ سوئٹس کی پچھلی گلی سے سیدھا اڑو کلب۔ ویسے گوگل میپ پر ایپ بتاتی جاتی ہے۔ ورنہ رکشہ کرلیں اسکو پتہ ہوتا ہے۔ کریم والے کے پاس تو جی پی ایس ہوتا ہی ہے سو وہ ہائر کرلیں۔ خود ہی گاڑی یا موٹر سائکل چلانی ہے تو ایک چھوٹی منرل واٹر رکھ لیں مبادا کہ راستہ بھٹک جائیں اور پیاس لگے، ویسے تو آجکل ہر ہی دکان میں چھوٹی منرل واٹر ملتی ہے۔

ویسے ہے رائیل ڈھاکہ والی گلی میں۔

ہائے رے "وہ"

وہ کراچی میں جاں گزاں ماحول میں جاب کر چکا تھا، شادی کر چکا تھا اور وہ بھی صرف ایک، کھلونے مانگتے اور موبائل توڑتے بچے سنبھال رہا تھا، میٹھے رشتے داروں اور رسیلے دوستوں سے ملتا رہتا تھا۔ وہ کراچی کے زندہ رہنے کے تمام امتحانات سے کامیابی سے گزار چکا تھا۔ وہ ایک عارف تھا۔ اسے دور و قریب، ماضی اور حال، آفس و رشتہ دار، محلے اور محلے والوں کے رشتے داروں سب کی خبر تھی۔ وہ سیاست دانوں کی بچیوں کے فون نمبر سے لے کر مصنفین کی قومیتوں اور زبانوں سب سے واقف تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے موجودہ جائے حیات سے لے کر اُن کے یونیورسٹی رول نمبر سب سے واقف تھا۔ وہ کمال کا شخص تھا کہ اس کا ایک قدم دنیا میں ہوتا تو دوسرا وراء الوراء پر ہوتا اور اگلا اپنے ساتھ کام کرنے والے فنڑ کی جیب میں۔ وہ سکڑ کر اپنی باری کا انتظار کرتا اور پھیل کر ہر مرد سے آگے ایک جست لگاتا اور ایک پپی ادھر اور ایک پپی ادھر کرتا۔ وہ ایک مہیب شیر تھا جو کبھی کبھی اپنی دم سے لطف اندوز ہوتا تا کہ کراچی کا جاں گسل ماحول اس پر حاوی نہ آسکے۔ ہر مرد اس کے آگے نامرد تھا۔ وہ برق رفتاری سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو ایک باکس میں بند کرتا اور لیبل چسپاں کرتا اور پھر جیسے چاہتا کبھی تکہ کبھی فیرنی کبھی ملائی بوٹی بنا کر نوش جاں کرتا۔ وہ کسی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہتا تھا کیونکہ وہ امیر نہیں تھا۔ وہ گیس کے گیزر کے بجائے شمسی توانائی سے چلنے والا گیزر استعمال کرتا۔ ہر وہ شخص جو گیس کے گیزر کی موافقت میں بولتا وہ اسے دسمبر کی سرد شاموں میں مقابلہ کرنے کی دعوت دیتا۔ وہ پٹھان کے ہوٹل کا دیوانہ اور پیزا کھانے کے آداب سے بے خبر تھا۔ اسکو خوابوں والی کتابوں اور شخصیات سے حد درجہ عناد تھا کہ خواب بندے کا بلا وجہ ہی واٹ لگا دیتے ہیں اور ماموں بنانے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ بس اب اس عارف دوست کے کمالات اور کہاں تک ضبط تحریر میں لائیں جائیں کہ ہر تحریر گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہے۔

پٹواری اور یُوتھئے

نوازے اور بوٹیے میں گہری دوستی تھی۔ دونوں چچا پمپ کے پاس یتیمی کی زندگی عالیشان انداز میں گزار رہے تھے۔ یہ دونوں ملکہ سے ہوئے تھے۔ فنون حرب کے ماہر تھے۔ نورا کشتی ایسی لڑتے کہ لوگوں کو لگتا کہ اب انصاف ہوا کہ تب۔ دونوں کشتی کے بعد کھی کھی ہنستے۔ لیکن دیکھنے والے منہ میں انگلی ڈال کر دانتوں سے چبا ڈالتے۔ کمال کا فن تھا۔ دونوں پڑھے تھے لیکن لکھے نہیں چنانچہ حکومت کے رسیا تھے۔ زمین ایک تھی لیکن نوازے اور بوٹیے ملا کر کل دو تھے۔ نوازے کو دھاکے کرنے میں ملکہ حاصل تھا اور بوٹیے کو ڈیم کے چندے میں الجھانے میں یدطولی حاصل تھا۔ بحیرہ عرب کے قریب نوازے کے بجیرے دوستوں کو فن جمعداری میں سے خاص حصہ ملا تھا۔ جونہی بوٹیے پانی بند کرتے، بجیرے جمعداروں کو آنکھ مار دیتے۔ یوں ملک خداداد میں انتظام کے ساتھ تماشا کامیابی کے ساتھ جاری تھا۔ بوٹیے سخت مزاج کے تھے سو ان کی نوازے اور بجیرے سے ہٹی رہتی تھی۔ وقت یونہی گزر رہا تھا کہ ایک دن نوازے نے ڈان کو آنکھ ماری اور اس نے کچھ لیک کر دیا۔ بوٹیے کے پیمپر نہیں بندھا تھا سو لیک کی گندگی باہر آ گی۔ اچھا خاصا سوٹ خراب ہو گیا۔ بوٹیے نے نوازے کو آنکھ ماری اور کہا وھت تیرے کی سو ہیئے ذرا دس سال کے لیے بامشقت آرام تو فرما سانوں کسی ہور نال میچ فکس ہے۔ چچا پمپ نے بھی اسکی توثیق کر دی۔ نوازے کو یہ بات بری لگی اور اس نے شاہ کی تو بلوچستان میں رئیسانی ایک سوتیس لوگوں سمیت بوٹیے کی طرفداری سے برطرف

ہو گئے۔ اسی قسم کی آنکھ نوازے نے اس سے قبل بوبیے کے بچوں کے ایک اسکول میں بھی ماری تھی تو شاہ نے لبیک کہا تھا۔ شاہ ایسے کاموں کو حج سے بڑھ کر عبادت جانتا تھا۔

ابھی نوازے اور بوبیے پر عظیم فکر جاری تھی کہ گھر کے کچن کا گٹر بھرا اور پانی گھر میں آنے لگا۔ اس سے قبل بھی لڑکا کامیابی سے بیت الخلاء کے گٹر سے کامیابی سے نمٹ چکا تھا۔ اس قسم کے ہتھکنڈے لڑکے کے عزائم کو متزلزل نہیں کر سکتے تھے۔ جونہی گھر میں صدائے گٹر کی غوں غاں بلند ہوئی لڑکے نے دیگر تگ و دو چھوڑی اور ایک جست لگا کر موبائل سے یونین کے ایک سرکردہ کو فون لگایا۔ کیونکہ اسکے پاس ایک ناکارہ جمعدار تھا سو اس نے کہا جی آیا نوں۔ ناکارہ جمعدار ''بے پکی'' کیری کی طرح جھولتا لیکن اڑیل گٹر سانس روکے کھڑا تھا۔ وہ یوں ہار ماننے والے نہیں تھا۔ گٹر بھرا ہے۔ سب چھپ چھپ کر کے کام کر رہے ہیں۔ ہر گٹر ایک ذی شعور جمعدار کی محبت کا منتظر ہوتا ہے جو اس میں اتر کر گندگی صاف کرنے کے عشق کو امر کر دے۔ وہ دن و رات ایک ایسے جمعدار کا خواب دیکھتا ہے جو اسے رواں کر دے۔ لڑکے نے گٹر کا وسیع تجربہ رکھنے والے جمعدار کو فون لگایا تو لگا کہ وہ پتنگ اڑانے میں مصروف ہے۔ ایک منجھے ہوئے جمعدار کو گٹر کے سانس روکنے کا علم ہوا۔ اسکو ایسے گٹر کو گدگدانے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس نے جونہی ہاتھ لگایا گٹر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

ووٹ حمق زدہ

ووٹ ایک ایسی حماقت ہے جو آپ کے پاس بطور امانت آپ کی حماقت کی سبب رکھی گئی ہے۔ اب چند ایسے معتبر لوگ بھی ہیں جو اس امانت کو پوری طرح ادا کرتے ہیں مطلب ثابت کرتے ہیں کہ ہم واقعی ہیں۔ امانت رکھنے والے عموماً مسکراتے ہیں لیکن امانت ادا کرنے کے اس جوش پر منہ کھول کر، کبھی کنارہ لے کر اور کبھی منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہیں۔ کچھ نے یہ پکڑ لیا ہے کہ بھائی کچھ ہو نہ ہو ہمیں بنایا جا رہا ہے سو وہ کینسل والا ووٹ ڈال کر آتے ہیں تا کہ کوئی یہ اہم امانت چرا کر کسی اور کو نہ دے۔ مطلب بنتے بنتے نہ بنے لیکن پھر بن گئے۔ اس میدان کے اصل ہیرو وہ ہیں جو ووٹ بالکل استعمال نہیں کرتے بلکہ وقار کے ساتھ گھر میں تشریف فرما رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں حکومت ووٹ سے نہیں رعب سے بنتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر وہ ہوتا تو ووٹ دیتا یعنی وہ بھی بن گئے کہ اگر وہ ہوتا تو میں بھی بن جاتا۔ کیونکے وہ نے نہ کبھی پیدا ہونا ہے اور نہ ووٹ مانگنا ہے سو کبھی بنتے نہیں لیکن بنے ہوئے رہتے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی۔۔۔

سب انسانوں کی خواہشات ایک جیسی ہی ہیں جان بچی رہے اور شادی ہو جائے۔ اہل و عیال کھالیں جسکو دینا چاہیں دیں۔ مال بڑھے اور بھتہ نہ دینا پڑے۔ آسائش بڑھے یہاں تک کہ ممی ڈیڈی برگر افراد کے مقابلے تک جا پہنچیں۔ سو ووٹ دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ جو ووٹ دیتا ہے اس کا آئی کیو ووٹ نہ دینے والے کے مقابلے میں ۱۰۰ پوائنٹ کم ہو جاتا ہے۔ اب کی بار فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

خرگوش

آج وہ دو خرگوش خرید کر لائی تھی۔ وہ جلدی سے اس کے گھر کے لان میں دونوں خرگوشوں کو ڈال کر بھاگی۔ وہ سامنے والے گھر میں ایک خوبرو خاتون کی تیمارداری میں مصروف رہتی اور پردے کے پیچھے سے بستر کی چادر تبدیل کرتے ہوئے روز اس لڑکے کو کووں کی تصاویر کھینچتے دیکھتی۔ وہ عموماً کووں کو دانہ ڈالتا اور کھڑکی کی اوٹ سے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوتا۔ آج جب حسب معمول وہ کووں کا ذہن بنا کر جب کھڑکی پر آیا تو اس کے من کی ایک کلی سی کھل گئی۔ تین کووں کے ساتھ دو خرگوش بھی برف کے اوپر پڑی اسٹابیرز کھانے میں مشغول تھے۔ وہ اسے دل سے چاہتی تھی۔ وہ جہاں جاتا اس کا پیچھا کرتی۔

ایک دن وہ امریکہ کی خوبصورت سنہری دوپہر میں گاڑی چلاتا جا رہا تھا۔ وہ گنگنا رہا تھا۔۔۔ سانوں نہر والے پل تے بلا کہ چن ماہی کتھے رہ گیا۔۔۔ اٹینڈنٹ اس کے پیچھے پیچھے ہو لی تھی جس

کی اس کو خبر نہ تھی۔ اس نے اپنی کار قریب کی اور ہائی ڈیفی نیشن کیمرہ اور ایمپلی، نائٹ ناکون کیمرے سے اس کی ویڈیو بنائی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا ہر ساز اور سرگم اس کے لیے ہے۔ یہ ویڈیو اس نے پیسے دے کر ایک پنجابی جٹ سے انگریزی میں ترجمہ کرائی تو پتہ چلا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ اٹینڈینٹ ویئر ہیو یو بین آفٹر کالنگ می آن بریج۔

جب جب وہ نیلی ٹی شرٹ پر اسکائی بلیو ہیٹ لگا کر اپنے بیٹے کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تو وہ تھرڈ ایمپائیر کی طرح کھڑکی سے اس کو دیکھتی۔ اس کو بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا سو وہ ہلکی بال اپنے بیٹے کو کراتا اور زور سے شاٹ اس کے گھر کی طرف مارنے کو کہتا۔ پھر خوشی خوشی خود ہی بال لینے کے لئے اس کے گھر تک جاتا۔ اس کا بیٹا لاکھ اسکو کہتا کہ پاپا آپ بھی بیٹنگ کریں نا تو اس پر وہ نفی میں سر ہلا دیتا اور کہتا بیٹا آپ اس کاونٹی میں واحد مسلم بیٹس مین ہیں۔ پہلے بیٹ کو سنبھالنا سیکھ لیں پھر بال پر آیئے گا۔ اس کا بیٹا اس کا انتہائی فرماں بردار تھا وہ کہتا ''اوکے پاپا!'' وہ اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہتا کہ اس پر ایک نظم ضرور لکھنی ہے۔

''اوکے۔'' اس کا بیٹا کندھے گراتے ہوئے جواب دیتا

''اوکے پاپا۔''

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ جب بھی وہ پراجیکٹ کی بات کرتا اٹینڈینٹ سمجھتی کہ وہ اس کا تذکرہ کر رہا ہے۔ وہ اس کی وائس ٹیپ کرتی تھی اور اپنے جٹ بنجابی دوست سے ترجمہ کر کے دن رات سنتی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ آخر وہ اسے اپنا کیوں نہیں لیتا جبکہ وہ اس کے لیے دن رات چائے بنانے کو بھی تیار ہے۔ رقم آل ریڈی اس کے پاس اتنی ہے کہ ہر براعظم میں اس کا ایک گھر ہے۔ آخر وہ کیوں ایک چائے تک حاصل کرنے کی خواری جھیل رہا ہے؟ وہ نسرین، مہ جبین اور کلثوم کے فرضی ناموں کو استعمال کر کے اٹینڈینٹ کے بارے میں ایسے ایسے عشقیہ اشعار کہتا کہ جہاں وہ اپنا کلام سنا دیتا، تین تین دن تک وہاں سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی رہتیں۔

اب کی باری وہ بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے پاکستان آ کر کوئٹہ عنابی ہوٹل پر اپنے دوستوں کے ساتھ ایک آخری میٹنگ کا اہتمام کیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ پٹھان کی چائے کی خاطر اس کے دوست اس کو ایسے ایسے قیمتی مشوروں سے نوازیں گے کہ وہ دن دور نہیں جب کرکٹ دو نہیں تین لوگوں کے ساتھ ہو گی اور خرگوش پالتو ہو جائیں گے۔ اس کی دوست چائے کے ساتھ پراٹھوں کے دیوانے تھے یہاں تک کہ ان کے اکاونٹ پٹھان کے ہوٹل میں کھلے تھے۔ اس نے پاکستان آنے سے پہلے ہی بھارت میں بنی ادھیڑ عمر کے مردوں کی نوعمر لڑکی سے شادی پر فلمیں بھی دیکھنا شروع کر دیں تھیں تا کہ کچھ مومینٹم بنے۔ وہ ڈگریوں سے بے زار اور ہاتھ سے بنی چائے کا طلبگار تھا۔ اس نے اے سے لے کر زیڈ تک ہر ہر قسم کی ڈگری دیکھ لی تھی لیکن اب وہ لانگ ڈرائیو پر ایک گرم پیالی چائے کی طرح کے ساتھی کا متمنی تھا۔ اس نے مسجد میں دعا اور گرومندر پر پانی کی سبیل بھی اسی لیے لگائی تھی۔ وہ عراق کے متبرک مقامات کے سفر کر کے گڑگڑا کر دعا کر اور اپنے ہاتھ سے تبرک تقسیم کرتا کہ شاید گرم چائے کی پیالی اس کی ہو جائے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک نہیں دو اٹینڈینٹ اس کی ہوں گی۔

پھر بھائی جان

کم ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ جان بھائی پکوڑوں کے عاشق تھے۔ جب سے لیاقت آباد کے سیکٹر انچارج طاہر کمانڈو سے رسم و راہ بڑھی تھی یہ شوق دو چند بلکہ سہ چند ہو گیا تھا۔ بار ہا اس کے ساتھ جان بھائی نے لیاقت آباد پل کے گول گپے اور الحرمین الآصف اسکوائر کی نمکین بوٹی کھینچ ڈالی تھی۔ اب کی بار طاہر کمانڈو نے جان بھائی کو پکڑ لیا اور کہا ''بابو کچھ پکوڑوں پر ہو ہی جائے آج اپن کا پیٹ سیٹ نہیں۔ اگر کھانہ سکوں تو سن ہی لوں۔ میرا شوق پورا ہو گا اور امروہہ والے سمجھیں گے کہ ایک غزل نکال دی۔'' وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ جان بھائی نے گلا قدرے صاف کر کے مکھی دور کی اور کہا۔

سارے پکوڑے کھا کر آیا
پیٹ فل اپنے گھر آیا

آخرش کا رینا کھانے سے میاں
گڑ گڑ میں تیری کیا اثر آیا
تھا پکوڑے میں زیاں ہاضمے کا
ہر طرف سے میں اک آدھ اٹھاتا آیا
اب یہاں پکوڑے میں کبھی اپنے
نہیں کھاوں گا میں اگر آیا
میں رہا عمر بھر کھاتا پکوڑے
یاد رکھتا چورن کو عمر بھر آیا
وہ جووان ٹان نام تھا ایک پکوڑے کا
آج میں اسے بھی کھا آیا
مدتوں بعد گھر گیا تھا میں
جاتے ہی میں پکوڑا کھا آیا

جان بھائی پر آمد تھی سو پکوڑوں کے بعد دیگر اصناف غذائیہ پر طبع آزمائی کی۔ ایک انت دن تھا وہ۔

اب بھی پراٹھے میں آلو پڑتے ہیں
اب بھی کھوکے کی چائے ہے جاناں
جو زندگی بچی ہے اسے مت گنوایئے
بہتر یہی ہے آپ ہڈی گڈی کھایئے
کچھ تو بوٹی چھوڑو کم بختو
کچھ نہیں۔۔کوئی ہڈی ہی چھوڑو

طاہر کمانڈو خوش ہوا اور کہا جان بھائی کچھ ہمارا بھی تو تذکرہ کرو۔ پکوڑے پراٹھے ہی کھاؤ گے کیا آج۔ اس نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

ساتھیوں کی راہ پر اگر چلیے
چار جانب سے بھتہ لیتے چلیے
اِک عجب لہر جی میں آئی ہے
اس کی گدی پر چماٹ دھر چلیے
ہم پاپی سدا کے ہیں لیکن
حسبِ منشا کوئی جرم نہیں

ایک اور شعر ہو جائے، طاہر نے جان بھائی کے گال پر انگلی لگاتے ہوئے کہا۔

پرچی بہ پرچی، بھتہ بہ بھتہ، کھال بہ کھال، رسید بہ رسید
میں بھی ساتھیوں میں ہوں تو بھی ساتھیوں میں ہے

جان بھائی نے طاہر کمانڈو کو خوش ہوتے دیکھا تو عافیت اسی میں سمجھی کہ اجازت لی جائے۔ طاہر بولا جانو ابھی کدھر جاتے ہو، رات کا ایک ہی تو بجا ہے۔ تھوڑا حسینوں کا تذکرہ ہو جائے۔ جان بھائی نے کہا پھر تو اجازت ہوگی۔ وہ ہنسا۔ جان بھائی بولے۔

تم نہیں چاہتے حسین ہونا
چلو اچھا ہے، میک اپ نہیں کرنا
میں کیا ہوں بس دال روٹی
اُس شخص کو شیر مال چاہیے تھا
وہ شوخ رمیدہ مجھ کو اپنی
پتی کے پان میں نڈھال چاہیے تھا
ہمارے منگیتر کے محلے کی گلی سے
ہمارے حصے کی فیرنی لائی جا رہی ہے
کہاں لذت وہ شورڈھکن وجستجو میں
یہاں انگلی چھوڑ چمچے سے کھیر کھائی جا رہی ہے

یوں رات کے ایک پہر جان بھائی رکشہ کر کے اپنے گھر پہنچے۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ اب تک انہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔ خاکہ نگاری میں انہیں خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر سی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

دلشاد نسیم

صبح کی چائے کے ساتھ حسب عادت اخبار کی سرخیاں پڑھ رہی تھی کہ نظر ایک خبر پہ آ کے ٹھہر گئی۔ لکھا تھا" آج موسم خوشگوار رہے گا۔ بارش کا بھی امکان ہے۔"

کئی دنوں سے رم جھم کا یہ مذاق چل رہا تھا کہ خواتین خشک کپڑے تار سے اُتارنے کا ابھی ارادہ ہی باندھ رہی ہوتیں کہ سورج پھر سے مظلوم رعایا کو کسی ظالم حکمران کی طرح گھورنے لگتا پھر نہ ہوا نہ کالی گھٹا صرف حبس۔۔۔ ہوا نہ ہو کالی گھٹا نہ ہو تو موسم کیا خاک خوشگوار ہوگا، لہٰذا اخبار کا صفحہ پلٹ دیا مگر بے چین دل نے اُکسایا اور میں لاؤنج کا پردہ اٹھانے پر مجبور ہوگئی۔ پردہ اُٹھایا دیوار گیر کھڑکی کا ایک پٹ سرکایا تو کیا دیکھتی ہوں ہاڑ کی ۲۶ تاریخ اور ساون کا سماں۔۔۔

سورج کئی دنوں کے اوور ٹائم کے بعد شائد تھک کے یا پھر مارے شرمندگی کے بدلیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔۔۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر سورج کا کوئی دفتر ہوتا تو کراچی کا ہیڈ آفس تو برباد ہو چکا ہوتا۔ کراچی والے سورج کی حدت پر وہ احتجاج کرتے کہ الامان الحفیظ۔ پتھراؤ کرتے، دھرنے ہوتے اور جن کو ٹی ٹی کرائے پر مل جاتی وہ دو چار کرنوں کا خون تو ضرور کر دیتے۔

موسم واقعی خوشگوار تھا۔ جھوٹی اخبار نے آج سچی خبر دی تھی۔ کالی گھٹا نے شام کا منظر پینٹ کر رکھا تھا۔ ہوا کی شہ پر سبز پتے یوں جھوم رہے تھے جیسے کبھی احمد رشدی نے کہا تھا" جھوم اے دل کہ تیرا جان بہار آئے گا۔"

میں چائے کا کپ لے کے گیراج کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی۔ فضا

کی خوشگواری نے کئی نغمے، کئی نظمیں یاد دلا دیں۔ پروین شاکر کی مشہور زمانہ نظم کا یاد آ جانا لازم تھا اور اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر آج وہ ہوتیں تو کیا کہتیں؟

اُن کی روح سے معذرت کے ساتھ۔۔۔

میں کیوں اس کو فون کروں
کیا اس نے اخبار بھی نہ پڑھا ہوگا
ٹی وی تو ضرور دیکھا ہوگا
لمحے لمحے کی اَپ ڈیٹس دیتا ہے چینل
اَن کہی بھی بریکنگ نیوز بنا دیتا ہے چینل
تو میں کیسے مان لوں، اسے خبر نہ ہوئی ہوگی
کہ میرے شہر میں صبح سے ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے
بدلیوں کا ہاتھ تھامنے کو گھٹا کس قدر مچل رہی ہے
لو بارش کا پہلا قطرہ گرا
اور مجھے خیال آیا
کیا اس کے شہر میں بھی ساون سے پہلے بارش ہو رہی ہوگی
کیا اسے بھی میرے ساتھ گزرے کسی ساون کی یاد
رلا رہی ہوگی

کیا وہ بھی سوچ رہا ہوگا
کہ جواب کے برس بھی بارشوں کے موسم میں
میں آ نہ سکی تو۔۔۔؟
کیا کوئی آنسو اس کی آنکھ سے بھی چھلک پڑا ہوگا
پڑ گیا آنکھ میں کچھ، کہہ کر چل پڑا ہوگا
اور کیا خبر کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو!
لوڈشیڈنگ بھی تو بہت رہتی ہے
ٹی وی اس نے دیکھا ہی نہ ہو
بے موسم کی برسات میں دل کہاں دھڑکتے ہیں
حبس جب بے حد ہو جائے تو نین ہی برستے ہیں

دلشاد نسیم صاحبہ کا میکہ تو کراچی ہے مگر روایتی ہجرت کے بعد مستقل سکونت زندہ دلانِ شہر لاہور میں ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے۔۔۔افسانہ۔۔۔ناول۔۔۔ناولٹ۔۔۔ڈرامہ سبھی کچھ لکھتی ہیں۔ بہت سے ڈرامے مختلف چینلز سے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی فرماتی رہتی ہیں۔ اِن کا قلم مزاح کے میدان میں خوب چلتا ہے۔ فیس بک پر خاصی متحرک ہیں اور مشقِ سخن کرنے کے ساتھ ساتھ نوآموزہ شعراء سے مشقِ سخن کروانے میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

بد عنوانیاں

پاپی پیٹ کا معاملہ ہو تو ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں۔ جس کے پیٹ کا حجم اور رقبہ جتنا زیادہ ہے اگر عقل گھاس چرنے نہیں گئی تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کتنا حرام ڈکار گیا ہوگا۔اس کے لیے تو تا چشمی بھی اختیار کی جاتی ہے اور کسی پر آنکھیں بھی نکالی جاسکتی ہیں۔ایسے نمونے دفاتر میں خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں بالخصوص ''طبقہ ٔ کلرکیا'' جس کے دیدے جیب پھاڑ ہوتے ہیں۔ایسوں کی زبان تالو سے لگتے ہی ضرورت مندوں کے چودہ طبق روشن اور دانتوں پسینہ نکل آتا ہے کیونکہ جس مطلوب کا تقاضا کیا جاتا ہے، وہ پیشگی طلب کیا جاتا ہے اور طبقہ ٔ مجبور خون پسینے کا کمایا اس کے حلق میں انڈیل کر معدے میں دوڑتے چوہوں کو کچھ دن انتظار کا کہہ کر کام نکل جانے تک سلادیتے ہیں۔

ایک بل پاس ہوتے ہوتے آنکھیں پتھرانے سے بہتر ہے کہ مک مکا سے کام چلالیں، کیونکہ پاک وطن میں گھی انگلیاں ٹیڑھی کرنے سے ہی نکلتی ہے اور اگر آپ اس قدر حساس ہیں کہ آپ کو ''الرّاشی والمرتشی کلاھمافی النار'' کا دھڑکا شدید تر ہے تو پھر آپ انتظار سوکھ کر کانٹا کردینے میں حق بہ جانب ہے۔

جب دیگر ساتھیوں کے بل چند دنوں میں پاس ہوجاتے ہیں تو حضرت نیک خصلت کے منہ میں پانی آجاتا ہے اور وہ چارو ناچار اسی ڈگر پر قدم رنجہ فرماجاتا ہے کہ آخر اُس نے

کون سی کسی کی کھوتی کھولی ہوئی ہوتی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وطنِ عزیز میں کوئی بھی دفتری کام بغیر رشوت، لوہے کے چنے چبوا دیتا ہے اور ''ٹرخا ٹرخا'' کر مجبور کو دق کیا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ دھندا دھڑلے سے جاری ہے اور ہر ذمہ دار اِسے ''کارِ سرکار'' کہہ کر جان چھڑاتا بلکہ ایسے جھمیلوں میں پڑنے سے کنی کتراتا ہے۔ ہم جیسے تو دانتوں میں انگلی دابے ''تماشائے اہلِ زحمت'' پر کڑھنے کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ منہ میں زبان ہی نہیں رکھتے۔ دل سے ہوک اٹھتی ہے اور دلآزاری کا یہ بازاری رویہ آدھ موا کر دیتا ہے لیکن اس قدر باغی ہونے کے باوجود ہم بقلم خود بھی سر جھکائے شرم سے پانی پانی نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ ہاتھ پیر بندھے ہیں اور سرکار کی کھولی میں سر دے رکھا ہے، اس لیے پیٹ کاٹ کاٹ کر کبھی جی پی فنڈ، کبھی پیشگی تنخواہیں نکالنے کے لیے ایسوں کے درِ دولت پر ماتھا رگڑنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتے۔۔۔ کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟

اوپر کی آمدنی پر پلنے والا ایسا بدن ہمیشہ لرزہ براندام رہتا ہے لیکن کافر منہ سے چھٹتی کہاں ہے۔ بڑے بڑے راسخ العقیدہ لوگوں کو پیٹھ دکھاتے اور ایسے جھمیلوں سے پہلو تہی کرتے دیکھا ہے، اگرچہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھ کر یا چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔

دفاتر میں فائلوں کے پلندے دیمکوں کی خوراک اور گرد کی جائے رہائش ہوتی ہے جبکہ اعلیٰ افسران صاحبان میز بجاتے، یہ
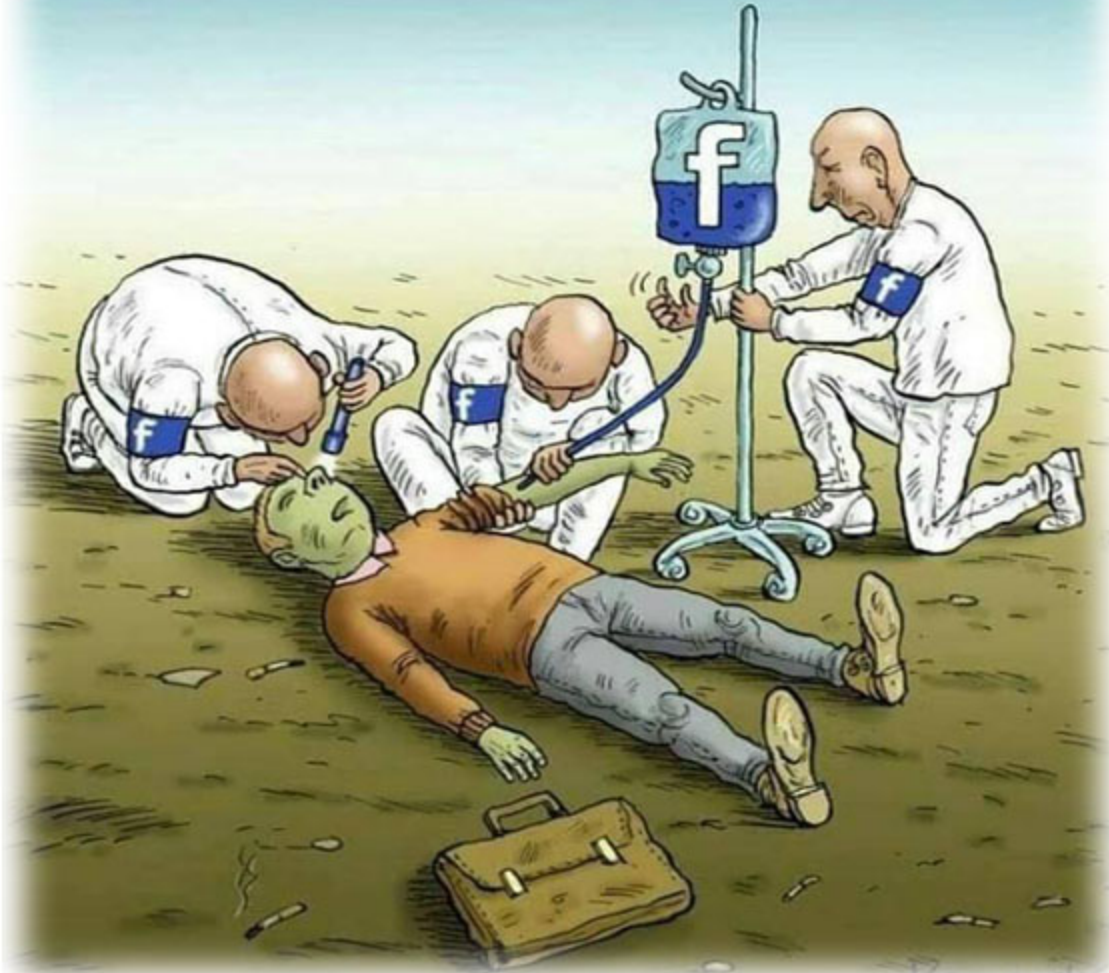
دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام گاتے، چوزوں کو پھانسنے کے لیے لٹھ لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔

عموماً کہا جاتا ہے ہزار محلات اجاڑ کر ایک گھروندہ تعمیر نہیں کیا سکتا لیکن ایسوں نے تو جہنم میں ناری محلات کھڑے کر دیے ہوتے ہیں۔ بعض بلند منصب اِتنے دبلے ہوتے ہیں کہ ہوا کے معمولی جھونکے سے بھی دھڑام گر جائیں مگر بھلا جوع البقر ختم کہاں ہوتی ہے۔

ہنسی آتی ہے بعض حضراتِ بد بختاں پر کہ ساٹھ سال تک حرام کھانے کے بعد حج پر نکل جاتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ بصد شوق لاحقہ کے طور پر ''اجی۔ حُ'' یوں لگا لیتے ہیں جیسے یہ بھی کسی قسم کی کوئی ڈگری ہو۔ ایسوں میں حلم حرام نہ کھانے کی خوبی پائی نہیں جاتی اس لیے حج کی قبولیت کا معاملہ تو اُس ذات کے پاس ہے لیکن کرتوت سے سارے ڈسے ہوئے ''اجی صیب'' کہہ کر منہ بسورتے رہ جاتے ہیں۔ ظالم کے منہ پر کلمۂ حق کی تاب کسی کو بھی نہیں۔

اگر حکومت کی سیدھی آنکھ میں آئے تو لرزہ براندام ورنہ سوئی ہوئی آنکھ کے نیچے برسہا برس سے ایسا کھیل تو بہر حال جاری ہے جبکہ محتسب خود بھی تالی میں چھید دیکھ کر منہ آگے کر دیتا ہے کہ مجھے بھی سالن چاہیے، چاہے ٹکا کے ملے۔

اللہ تعالیٰ ہی ایسوں کو غارت کرے جو ایسا کرتے ہیں۔ دار الفنا میں ایسے خبیث لوگ پکڑ میں نہیں آتے کیونکہ شیطان کے چیلے جو ہوتے ہیں لیکن جب روزِ محشر لاکھوں کے حق کندھوں پر اٹھائے بوجھ تلے چیخ رہے ہوں گے تو پھر لگ پتہ جائے گا کہ دنیا اچھی تھی یا جنت۔

نوکر شاہی کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، اپنے ہی ادارے کے لوگوں کا کام اُوپر کی اجرت سے کرنا اُس کی عادتِ ثانیہ بن گئی ہے اور حالت یہ ہے کہ منہ سے یہ کافر لگی چھٹتی ہی نہیں۔ اگر وہ اپنے لیے ان پیسوں سے شیش محل بھی بنوا لیں، نوکر چاکر خادمائیں، دربان رکھ لیں پھر بھی بے سکونی و اضطرار پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اللہ میاں توفیق ہی نہیں دیں گے کہ بال، دانت گرنے کے بعد بھی توبہ کرنے کا متحمل ہو سکے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ سبکدوشی کے بعد ایسے لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں یا پھر کسی ایسی موذی بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جس کا علاج کسی بھی طبیب، ڈاکٹر یا روحانی عامل کے پاس نہیں ملتا۔ اب تو ''حرفتِ جانکاری'' کی ترقی کے باعث یہ سارا تماشا اوپن سیکرٹ کی طرح اِن کی نظروں کے سامنے رہتا ہے لیکن چور، چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اپنی نافرمان اولاد کے لیے شبانہ روز جتا ہوا حرام جمع کر رہا ہوتا ہے۔ اس انجام سے بے خبر کہ اسی اولاد نے اُس کی ریٹائرمنٹ کے بعد اُسے دولتی مار کر گھر بدر کر دینا ہے یا اپنی اپنی بیگمات کو لے کر الگ ہو جانا ہے۔

میں نے جہاں تک تجزیہ کیا ہے یعنی جن رشوت خوروں کو نزدیک سے دیکھا ہے اس کو کبھی سکون میں نہیں پایا بلکہ بعض کی اولاد تو اتنی ناخلف ہوتی ہے کہ اردگرد کے لوگ تک اُن کی بدکرداریوں کی وجہ سے اُن سے قطع تعلق کیے ہوئے ہوتے ہیں یا وہی اولاد نکمی ہوتی ہے جو باپ کی کمائی پر گل چھرے اُڑاتی پھرتی ہے یا بدمعاش بنی مکافاتِ عمل کی گردش میں گم ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ حرام مال سے پرورش کے علاوہ اور کون سی ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے بچوں کو اکلِ حلال کھلاتے ہیں، وہ کبھی بدتمیز اور ہڈ حرام نہیں ہو سکتے۔ یہ جانی مانی بات ہے جبکہ دوسری طرف یہ بات بھی جانی مانی ہے کہ حرام کھائی اولاد ایسی ہی ہو سکتی ہے۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوند خوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری اور مضمون نگاری بھی ان کے ابلاغ کے ذرائع ہیں۔ شاعری میں خاصے پُرگو واقع ہیں۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ ففٹی ففٹی ہوتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل کرم فرما ہیں اور اس کے پڑھنے والوں کے لئے ہر ماہ باقاعدگی سے مرچ مصالحے کا اہتمام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صابر حسین خان

آسان کام

دنیا کا سب سے آسان کام باتیں کرنا، باتیں بنانا، دوسروں پر تنقید کرنا اور لوگوں کے عیب نکالنا ہوتا ہے۔ اس کام میں ہم سب ایکسپرٹ اور ماسٹر ہو چکے ہیں۔ یہ کام اتنا آسان ہے کہ ہم اپنے اپنے کام کرتے ہوئے اور اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے بھی اسے بڑی دلجمعی سے کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

یہ ہمارا بہترین مشغلہ بھی ہے اور دل کے پھپھولے پھوڑنے کا شاندار طریقہ بھی ہے۔ ہم ہر طرح کے کام سے تھک جاتے ہیں مگر یہ کام اتنا مزیدار اور دل کو لبھانے والا ہے کہ ہم اپنی نیند، اپنی بھوک، اپنا آرام سب بھول کے بھی اس کام میں مصروف رہتے ہیں اور بالکل بھی نہیں تھکتے۔

گزشتہ ۲۰ برسوں سے ہماری ٹیوننگ اور گرومنگ اس طرح سے ہو رہی ہے، ہوئی ہے اور کی جارہی ہے کہ شور شرابہ، غل غپاڑہ، بحث مباحثہ، طنز و تحقیر، تنقید و تمسخر، اگر ہماری روزمرہ کی زندگی میں نمایاں نہ دکھائی دے تو ہماری مردانگی ہماری اپنی نگاہوں میں مشکوک اور باعث شرمندگی ہو جاتی ہے اور بزعم خود ہم لوگوں کے بیچ سر اٹھا کے چلنے کے قابل نہیں رہتے۔ ہماری نئی نسل کا قصور نہیں۔ وہ تو پوری کی پوری کمپیوٹر ایج کی پیداوار ہے اور اس کی جینیاتی ساخت ہی الیکٹرونک میڈیا اور پھر سوشل میڈیا کے زیرِ سایہ پروان چڑھی ہے۔ ہم جیسی عمر کے لوگوں کا کھانا بھی اس وقت تک ہضم نہیں ہوتا، جب تک ہم گھر یا باہر کسی سے الجھ نہ لیں اور اگر اس طرح کے سوڈامنٹ کا موقع نہ مل پائے تو کم از کم

۴۶انچ کے ایل ای ڈی اسکرین کے سامنے بیٹھ کر معاشرے کے اعلی و ارفع عہدوں پر فائز چمکتے دمکتے، چیختے چنگھاڑتے، ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے، لڑتے جھگڑتے طرم خانوں کی ایک جھلک نہ دیکھ لیں اور جو کسی وجہ سے اس تماشے کا بھی کسی دن ناغہ ہو جائے تو اس روز نیند بھی مشکل سے آئے۔

آج سے ۴۰ برس پہلے ٹی وی نہ صرف ذہنی تسکین اور تفریح کا بہترین ذریعہ تھا بلکہ اس زمانے کے بچوں، نوجوانوں اور ہر عمر کے لوگوں کی نفسیات، شخصیت اور کردار کی تعمیر اور ترتیب میں بھی اہم کردار ادا کرتا تھا لیکن آج اس میڈیا کو بلا شک وشبہ انفرادی اور معاشرتی انتشار، خلفشار اور بگاڑ کا تن وتنہا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری تفریح کے معیار اور معنوں کو ۱۸۰ ڈگری کے زاویے سے بدل ڈالا ہے۔ طنز، تنقید، تحقیر اور تمسخر کے ساتھ عدم تحفظ، عدم برداشت، نفرت، حقارت، بدلہ، انتقام اور غصہ جیسے منفی انسانی پہلوؤں کی پرداخت کر کے، نمایاں کر کے، زندہ رہنے کے لیئے ضروری قرار دے کر، اور کامیابی کے لیئے لازم وملزوم سمجھ اور سمجھا کر۔ ویلن کو ہیرو کی شکل میں پیش کر کے معاشرے کی بنیاد کھوکھلی کر دی گئی ہے۔ ہر طرح کا جرم، ہر طرح کی کرپشن، ہر طرح کی کمی اور کجی کو جسٹیفائڈ کر کے، ہر نیگیٹو انسانی رنگ کو ہرا، نیلا، پیلا اور گلابی پورٹریٹ کر کے۔ نفسانی اور حیوانی خواہشات کو نام نہاد آزادی کا نام دے کر۔

زندگی کے ہر شعبے کی طرح جب معاشرے کے سب سے معتبر اور باوقار شعبے، ادب وثقافت وصحافت کے تمام دائروں میں یہی سوچ و رویے گھوم رہے ہوں تو میں اور آپ، ہم سب، بھی غیر محسوس طریقے سے اسی رنگ میں ڈھلتے جا رہے ہیں اور اخلاق اور کردار کے انتہائی پستی زدہ حوالوں اور حاشیوں کو ہی زندگی کی معراج سمجھنے لگے ہیں۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی ہے کہ یہی بات، تفریح اور دلچسپی کا بھی سامان ٹھہری ہے۔ ایک دوسرے کے پرخچے اڑا دینا اور تالیاں پیٹنا۔ زور سے شور مچانا اور پھر چور مچائے شور کا شور ڈالنا۔ ہر عام و خاص کو پہلے ہر اچھے برے کاموں اور اچھی بری باتوں کی ترغیب دینا اور اکسانا اور پھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہر ایک کے عیب نکالنا اور عیبوں اور خامیوں کو بیچ چوراہے سب کے سامنے ٹانگتے رہنا۔ اور گھنٹوں، دنوں، ہفتوں تک ان پر رننگ کمنٹری کرتے رہنا اور ڈھول پیٹ پیٹ کر بھیڑ جمع کرتے رہنا۔ اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ اور کیا ہوگا۔ اس سے زیادہ آسان کام کوئی اور کیا ہو سکتا ہے۔ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری، اور رنگ بھی چوکھا آئے۔

سفارش کی مکروہ ترین شکل غالباً وہ ہے جس میں سفارش طلب اپنی بیوی کو استعمال میں لاتا ہے۔ ممکن ہے بیوی بیچاری کا اس میں کوئی قصور نہ ہو لیکن سفارش طلب کی غیرت اتنی بے قصور نہیں ہوتی اور سفارش قبول کرنے والے کے لیے تو یہ ایک آزمائش کی کڑی گھڑی ہوتی ہے مثلاً آپ باہر سے گھر آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نہایت ہی معقول شکل اور خوش پوش خاتون تشریف فرما ہیں جنہیں آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا' بلکہ اب بھی غلطی سے آپ کے سامنے آ گئی ہیں اور بس رخصت ہونے والی ہیں۔ جب بعد میں آپ اپنی بیگم سے مہمان کا نام اور ان کی آمد کا مقصد پوچھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کوئی تین گھنٹوں کی نشست کے بعد رخصت ہوئی ہیں۔ بچوں کے لیے کھلونے لائی ہیں۔ سارے کنبے کو کھانے کی دعوت دے گئی ہیں۔ کوئی غرض نہیں' محض خلوص کی فراوانی کھینچ لائی تھی۔ نام بیگم ''ص'' بتا گئی ہیں۔ یہ سنتے ہی آپ کا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ ''ص'' ...... یہ تو وہی ذات شریف ہیں جو دفتر سے سٹیشنری چرانے کے جرم میں ماخوذ ہیں' تفتیش ہو رہی ہے۔ برخواستگی یا تنزلی کا امکان ہے۔ اس عبرتناک انجام کو ٹالنے کے لیے ''ص'' صاحب خود تو خدا سے لے کر خاکسار تک کا خوشامد سے گھیراؤ کر ہی رہے ہیں' اب بیگم ''ص'' کو بھی اس کار ثواب میں شامل کر لیا ہے۔

بزم آرائیاں ـــــ از کرنل محمد خان

سب کے مزے۔۔۔ سب خوش۔۔۔ باتیں کرنے، باتیں بنانے، باتیں گڑھنے، باتوں کے تیروں، بھالوں، اور نیزوں سے دل و دماغ چھلنی کرنے سے زیادہ اور کون سا کام آسان اور آج کے دور میں سود مند ثابت ہوسکتا ہے۔

ہم سب باتوں کے بادشاہ بن کر اپنے اپنے حلقوں اور علاقوں میں ایسی سلطنت چلا رہے ہیں جس میں ہمارے علاوہ باقی سب خراب اور غلط ہیں۔ وہ بھی اس وقت تک، جب تک وہ ہمارے حضور سر نہ جھکا لیں۔ اپنے نظریے چھوڑ کر ہمارے صحیح غلط خیالات نہ اپنا لیں اور ایسا جس لمحے ہو جائے، ان کے سارے گناہ ڈھل جاتے ہیں اور وہ دنیا بھر کی برائیوں اور غلطیوں میں تمام عمر ملوث رہنے کے باوجود پھر معصوم اور پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ بس اس کے لیئے ان کو ہماری باتوں کی بادشاہت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے تمام تماشے، ہماری تمام تنقید، ہماری تمام کڑوی اور تلخ باتیں محض اوروں کو نیچا دکھانے، نیچا بنانے اور اپنے سے نیچا ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے اور جونہی جو جو سرینڈر کرتا چلا جاتا ہے وہ اپنوں کی صف میں شامل ہوتا جاتا ہے اور اس کا ہر غلط، صحیح قرار دے دیا جاتا ہے۔

معاشرے کی اسی سوچ اور مروجہ رویوں نے آج ہر برے آدمی کو بڑے آدمی کا ایوارڈ دے رکھا ہے، جس کی وجہ سے ہر آدمی شعوری یا لاشعوری طور پر اس معاشرتی آئیڈیل کے حصول کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ اسے ہر حال میں ہر وقت اپنا طاقتور امیج برقرار رکھنا ہے اور اس کے لیئے اسے ہر وقت خود کو غصیلا، جنگجو، متحرک اور باتونی رکھنا ہے۔ اسے ہر وقت ہر محفل میں ہر طرح کے بحث و مباحثے کے لیئے تیار رہنا ہے۔ اسے ہر وقت ہر حوالے سے سامنے والوں کو نیچا دکھانا ہے اور ہر وقت طنز، تنقید، تحقیر اور تمسخر کے ہتھیار استعمال کرتے رہنے ہیں۔ اسے ہر وقت ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت کمانی ہے اور سوسائٹی کے بڑے لوگوں سے تعلقات استوار کرتے رہنے کے لیئے ہر قدم اٹھانا ہے۔ تبھی وہ کامیاب کہلایا جا سکتا ہے۔ تبھی وہ بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ تبھی اس کی بادشاہت برقرار رہ سکتی ہے۔ تبھی اس کے کام آسان ہو سکتے ہیں۔ اور آسان کام اسی کے ہو سکتے ہیں جو آسانی سے آسان کام کرنا جانتا ہو۔ باتوں سے زیادہ اور کون سا کام آسان ہو سکتا ہے۔ اور اس کام میں تو ہم سب ہی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مشکل کاموں کا کسی کے پاس نہ دل ہے نہ وقت۔ اور نہ ہی کوئی ظاہری فائدہ۔ تو وہی کچھ کرتے رہنا چاہیئے جو اور سب کر رہے ہیں۔

اس میں حرج بھی کیا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ آج ہمارا ہاتھ کسی کے گریبان پر ہے تو کل کسی اور کا تھپڑ ہمارے چہرے پر ہوگا۔ آسان کاموں کا نتیجہ بھی آسان ہی ہوتا ہے۔ قدرت کا قانون یہی ہے اور ہر ایک کے لیئے ہی ہے۔ قدرت کسی کے لیئے بھی اپنے قاعدے قانون نہیں بدلتی۔ نہ کسی کو معاف کرتی ہے۔ جو جیسا کرتا ہے۔ وہ ویسا بھرتا ہے۔ آج ہم طنز، تنقید، تحقیر اور تمسخر کے آسان کاموں میں مصروف رہ کر باتوں کے بادشاہ کا خطاب پا رہے ہیں۔ کل ہم کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالے وہ سب کچھ سننے سے بچنا چاہ رہے ہوں گے جو آج ہم گلے پھاڑ پھاڑ کر سنا رہے ہیں۔

کتنا ہی اچھا ہوتا کہ وقت کی ترازو کا پلڑا پلٹنے سے پہلے ہمیں سمجھ آ جائے اور ہم اپنے اپنے آسان کام اور شارٹ کٹ چھوڑ کر مشکل کاموں اور دشوار راستوں کا انتخاب کر لیں۔ آپ اپنا احتساب کر لیں۔ کہ قدرت کا حساب کتاب پھر ہم سے برداشت نہیں ہو پائے گا۔

ڈاکٹر صابر حسین خان اُن ڈاکٹروں میں سے ہیں جو مریضوں کا علاج نسخوں کے ساتھ ساتھ مضامین سے بھی کرنے کے قائل ہیں۔ اِن کے مضامین میں طنز و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اِن کا شعبہ نفسیات ہے۔ یہ ماہر نفسیات ذہنی، دماغی، اعصابی، روحانی، جسمانی، جنسی اور منشیات امور ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف، کالم نگار، بلاگر، شاعر اور پامسٹ بھی ہیں۔ drsabirkhan.blogspot.com پر ان کے بلاگز کا مطالعہ صحت کے لئے خاصا خوشگوار ثابت ہو گا۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے یہ اِن کی پہلی تحریر ہے۔

حافظ مظفر محسنؔ

اعلیٰ درجے کے خوشامدی کی تلاش

مجھے خوشامد کرنے والوں سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ خوشامد کرنے والے ''تمام'' انسان نہیں ہوتے ویسے یہ ''خاص'' بھی نہیں ہوتے۔

پچھلے دنوں ایک رن مرید نے مجھ سے رابطہ کیا ''اور عرض'' کی ''حضور والا ہم بھی خوشامدوں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں یا نہیں؟'' (آپ یہاں پر تصور نہ کریں کہ ہم بھی رن مریدوں کی صف میں کھڑے ہیں۔)

آپ حیران نہ ہوں، ''رن مرید'' درجے میں خالص خوشامدی سے ''نہیں بچے'' کے درجے پر فائز ہیں کیونکہ ''رن مرید'' نے صرف بیوی کی خوشامد کا بیڑہ اٹھا رکھا ہوتا ہے، ہر دم بیوی کو خوش کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ بیوی جتنی بھی ظالم ہو، اُس نے بہر حال رن مرید کو آخر کار اپنے ''پیروں کے نیچے چھپا'' ہی لینا ہوتا ہے (اخلاقیات بھی تو کوئی چیز ہے؟)

ویسے یہ ''رن مریدی'' بھی اِک عرصہ تک چلتی ہے، اُس کے بعد مرد کے اندر سے اکھڑ قسم کا نہایت بدتمیز مرد باہر نکل آتا ہے اور عورت بیچاری منہ دیکھتی رہ جاتی ہے اور وہ مرد کے طور پر کہنے لگتا ہے ''آخر اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت بھی تو دے رکھی ہے؟''

یہ وہ مردانہ ہتھیار ہے جس کا مقابلہ کسی۔۔۔ یا تلوار سے ہونا ممکن نہیں۔

ایک آدمی جو جوانی میں رن مرید رہا تھا اور بیوی کی فرمانبرداری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، بڑھاپے میں پہنچا تو ایک دن ایک بچپن کا دوست کھانے پر آیا۔ وہ یعنی سابقہ رن مرید بیوی کو ہر بات پر ''جانو'' کہہ کر محبت سے پکارتا۔۔۔ ''جانو یہ پکڑو!''۔۔۔ ''جانو یہ دیکھو!!''۔۔۔ ''جانو یہ کھاؤ!!!''۔۔۔ ''یہ پہنو جانو!!!!''

بچپن کے دوست نے حیرت سے پوچھا ''ارے بھائی اب تو یہ خوشامد یا رن مریدی سے کنارہ کشی اختیار کرلو۔۔۔کیا جانو، جانو لگا رکھی ہے تم نے۔۔۔''

دوسرے نے مسکراتے ہوئے پہلے کے کان میں آہستہ سے کہا ''اصل میں گھبراؤ مت، بتاتا چلوں کہ میں بیوی کا نام بھول چکا ہوں اِس لئے'' جانوں، جانوں'' کہہ کر پکارتا ہوں۔''

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ رن مرید صرف اِک عدد یا کہیں کہیں دو عدد بیویوں کے تابعداری کا فریضہ سرانجام دیتا ہے جبکہ خوشامدی عادت سے مجبور، ہر اک کی خوشامد کرنا ہوتی ہے۔ ہمارے دوست جن کے ہاں جب بھی ہم گئے۔ اُنہوں نے کھانا اصرار کر کے کھلایا اور آپ سن کر خوش ہوں گے کہ ہر بار ہمیں کھانے میں ''ساگ'' ہی پیش کیا گیا کیونکہ ہماری بھابھی صاحبہ کے ابو جان کے گاؤں میں ''ساگ کے باغ'' ہیں۔ بھابھی صاحبہ کے ساتھ ساتھ سسر صاحب کو بھی خوش کر ڈالتے ہیں اِک یعنی اپنی رن مریدی کا فریضہ بھی سرانجام دے ڈالا اور سسر صاحب کی خوشامد بھی لگے ہاتھ کر ڈالی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بھی اُس کے اصرار پر کھانا کھایا، دو تین دن پیٹ میں ''گڑ گڑ گڑ گڑ'' ہوتی رہی اور ہم ''ساگ'' کے فیض و برکات اور ساگ کی موجودہ صدی میں اہمیت و افادیت پر لیکچر بھی سنتے رہے حالانکہ در پردہ اِک رن مرید خوش آمدی اپنی عادت پوری کر رہا تھا۔

گاؤں میں ایک خوشامدی ہمارے دوست خاصے بڑے زمیندار ہیں لیکن گائے بھینس کے لئے چارہ (پٹھے) لانے کے لئے انہوں حسب دستور گدھا گاڑی بھی رکھی ہوتی ہے۔ نئے ماڈل کی کالے رنگ کی کرولا کے ساتھ اُن کی ''کھوتی'' بھی بندھی ہوتی ہے۔ ایک دن ہم نے دیکھا موصوف گدھا گاڑی پر چارہ (پٹھے) لاد کے کھوتی ریڑھی پر گاؤں کی طرف آ رہے تھے۔ جانور نے ذرا سستی کا مظاہرہ کیا اور پکی سڑک پر آگے جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے وہاں بھی خوشامد کا دامن نہیں چھوڑا اور آہستہ سے اُس کے کان کے پاس منہ کر کے بولے ''چل میری بہن۔۔۔ جلدی سے گاؤں لے جا۔۔۔ یہ لاہور سے آئے ہوئے تماش بین قسم کے لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ گاؤں میں کھوتی بھی اِن کی بات نہیں مانتی! چل شاباش جلدی چل۔۔۔ چل میری بہن شاباش!!''

جس کی خوشامد ہو رہی ہوتی ہے، اُس کی گردن میں سریا کیوں نہ آئے۔ لوگ یعنی خوشامدیوں کا ہجوم جس کے گرد ہوگا، وہ اپنی اوقات تو پھر دکھائے گا ناں۔

فواد چوہدری کسی گاؤں میں گئے۔ گاؤں والوں نے خوب آؤ بھگت کی۔ فواد نے کہا'' آپ لوگوں کے کچھ مسائل ہوں تو ہمیں بتایئے!''

گاؤں کے بھولے بھالے لوگوں نے کہا کہ'' ہمارے دو مسائل ہیں، ایک تو یہ کہ ہمارے گاؤں میں ایک بھی ڈاکٹر نہیں ہے۔۔۔''

فواد مسکرائے، کرتے کی جیب سے اپنا موبائل نکالا، کسی سے بات کی اور گاؤں والوں سے کہا کہ'' آپ کا یہ مسئلہ ہو گیا ہے۔۔۔ ہماری بات ہوگئی ہے اوپر۔۔۔ جلد ہی گاؤں میں ڈاکٹر آ جائے گا۔''

گاؤں والوں نے فواد جی کو دیکھا، کہا کچھ نہیں۔

فواد جی نے پھر کہا کہ آپ ہمیں اپنا دوسرا مسئلہ بتائیں!

گاؤں والوں نے دھیرے سے کہا'' ہمارا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس گاؤں میں کسی موبائل فون کا نیٹ ورک نہیں۔''

حافظ مظفر محسنؔ صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

خادم حسین مجاہدؔ

طوا ئفیں اور ریاکار مولوی

ملفوظاتِ حضرت گفتار غازی علیہ ما علیہ

اُس دن کافی تعداد میں مریدین اور عقیدت مند جمع ہو چکے تھے، جن سے بیٹھک لبالب بھر چکی تھی اور اب چھلکنے کو بیتاب تھی کہ حضرت صاحب اندر سے برآمد ہوئے۔ ان سب کو سلام کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ سلام کے جواب کے بعد سب نے ان کی خیریت پوچھی تو گویا ہوئے ''آپ لوگوں کی دعاؤں سے میں غم کی چھاتی پہ مونگ دَل رہا ہوں اور خیریت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر سلامتی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوں اور عافیت کے ساتھ دادِ عیش دے رہا ہوں، آپ اپنی سناؤ۔''

''حضرت، گستاخی معاف، آپ نے چپ چپاتے سلامتی، عافیت اور خیریت کے ساتھ مزید تین شادیاں کب کیں؟ اور غم یعنی زوجۂ اوّل نے آپ کو اس کی اجازت کیسے مرحمت فرمائی، اور تمام ازدواجی سہولیات سے فائدہ اٹھا کر کر آپ ابھی تک زندہ وسلامت کیسے ہیں؟'' ایک عقیدتمند نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو حضرت نے اس کی کم فہمی پر زانو پیٹ لیا اور بولے ''لگتا ہے تم نے رنگ رلیاں اور دادِ عیش کے الفاظ صرف اخبارات میں ہی پڑھے

ہیں، کسی اچھے استاد سے اُردو پڑھی ہوتی یا کم از کم لغات ہی دیکھ لی ہوتی تو اس خطرناک غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ پہلی شادی سے قبل اگر میرا شرعی سہولیات سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ تھا بھی تو پہلے ہی ازدواجی تجربے کے بعد اب ایسا سوچ کر بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میری گفتگو کا صرف یہ مطلب تھا کہ میں بخیر و عافیت ہوں اور یہ الفاظ اس لئے استعمال کئے تھے کہ میں چیک کرنا چاہتا تھا کہ آپ اس کے منفی اخباری مطلب ہی جانتے ہیں یا اس کے مثبت استعمال کو بھی سمجھ سکتے ہیں یا نہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مجھے آج بھی آپ لوگوں نے ہمیشہ کی طرح مایوس ہی کیا ہے۔''

حاضرین نے سر جھکا لیا تو میں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا کہ حضرت پیچیدہ مزاح کے علمبردار مشتاق احمد یوسفی فرماتے ہیں کہ پرانے زمانے کی طوائفیں آج کل کی طوائفوں سے کہیں زیادہ بدچلن ہوا کرتی تھیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

حضرت یہ سن کر مخصوص انداز میں مسکرائے اور بولے ''بیچارے یوسفی صاحب تو شریف آدمی ہیں، جوانی بھی اُنہوں نے یوں گزاری جیسے لوگ بڑھاپا گزارتے ہیں۔ تمھیں کیا پتہ پرانے زمانے کی طوائفیں زیادہ بدچلن ہوتی تھیں یا آج کل کی؟ ان کے پاس تو محض سنی سنائی بات ہے جو انہوں نے جڑ دی اور لوگ ان کے احترام میں خاموش ہوگئے، جیسے تم لوگ میری الٹی سیدھی باتوں پہ چپ ہوجاتے ہو۔ ورنہ ملٹی میڈیا کی بیوٹی سینٹرز اور فیشن انڈسٹری کی بدولت جو سہولت راہنمائی اور مواقع آج کی طوائفوں کو حاصل ہیں، قدیم زمانے کی طوائفوں نے تو ان کے بارے میں خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ امراؤ جان ادا کی ہی مثال لے لیں، ناول میں اس کا کردار پڑھیں یا فلم میں دیکھیں، وہ طوائف کم اور شریف زادی زیادہ لگتی ہے۔ یہ تو تم لوگوں کے علم میں ہی ہوگا کہ پرانے زمانے میں شرفاء اپنے بچوں کو تہذیب سکھانے کے لئے اپنے بچوں کو طوائفوں کے گھر رکھا کرتے تھے۔ آج اگر کوئی رسک لے تو یہ بچے بچپن میں ہی جوان ہوجائیں بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ میڈیا کی بدولت شرفاء کی بچیوں میں بھی کچھ کچھ طوائف پن پیدا ہورہا ہے۔ ہمیں اس کا کوئی سد باب کرنا چاہیئے۔ ہم سے تو مرزا ہادی رسوا کا زمانہ اچھا تھا، جب امراؤ جان ادا جیسی تمیزدار، مہذب اور باادب طوائفیں ہوا کرتی تھیں۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طوائف کم بدچلن ہو یا زیادہ، اس سے فرق کیا پڑتا ہے، رہے گی تو وہ طوائف ناں۔۔۔۔ بیوی تو نہیں بن جائے گی ناں۔۔۔ آپ یہ فرمایئے کہ یہ بیویوں کے ہوتے ہوئے طوائفوں کی آخر ضرورت کیسے پڑ گئی؟'' ایک مرید نے پوچھا۔

''جہاں تک سوال کا تعلق ہے تو سوال واقعے اور تشویش کے ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیئے جو دیگر ناجائز چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بس حیرت کی بات یہ ہے کہ سوال تمھارے ذہن میں پیدا کیسے ہوگیا کیونکہ مریدوں کا ذہن تو عموماً کام ہی نہیں کرتا، خصوصاً پیروں کے سامنے۔۔۔ اس کا مطلب ہے ابھی تم پکے مرید نہیں ہوئے ہو، جہاں تک طوائفوں کی ضرورت کا سوال ہے تو وہ صرف بدکاروں کی ہی نہیں بلکہ عشق کے مارے کنواروں اور بیویوں کے ڈسے شوہروں کے لئے بھی مرہم کا کام کرتی ہیں۔ ان کی محبت لاکھ مصنوعی اور کاروباری سہی، اس رویئے سے تو بہتر ہے جو بیویاں شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اختیار کرلیتی ہیں کہ ساری ضروریات پوری کرا کے بھی دو بول پیار کے نہیں بول سکتیں، اُلٹا کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں اور جن عورتوں کے شوہر طوائفوں کے پاس آنا جانا شروع کردیتے ہیں، اُن کی بیویوں کے ہوش بھی جلد ٹھکانے آجاتے ہیں، یوں طوائف کا کردار گھروں کو توڑنے میں ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی جوڑنے میں بھی کام آتا ہے۔''

حضرت کے پکے مرید تو سوچے سمجھے بنا سر دھن رہے تھے مگر ایک کچے مرید نے اعتراض جڑ دیا ''حضرت صاحب، آپ کس کی وکالت کررہے ہیں آپ پر فتوی بھی لگ سکتا ہے؟''

''کس میں جرأت ہے کہ مجھ پر فتوی لگائے۔ میں ان کے عمل کو جائز نہیں کہہ رہا، ایک حقیقت بیان کررہا ہوں اور طوائفیں اگر ظالم ہوتی ہیں تو کبھی مظلوم بھی ہوتی ہیں اور اُن پر فتوے لگانے

والے بھی ضرورت پڑنے پر اُن سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان کی پیری مریدی کا سلسلہ بھی دور تک پھیلا ہوا ہے اور کتنے ہی شرفاء کے بچے ان سے ہی پیدا ہوتے، پلتے اور پھر اسی لائن میں لگ جاتے ہیں۔'' حضرت کب ماننے والے تھے۔

''لیکن حضرت صاحب، ضرورت سے زیادہ حقیقت بیانی بھی اچھی نہیں ہوتی، ایک اور مرید نے جھجکتے ہوئے کہا ''سچ کہتے ہو میاں، یہ دنیا ہے ہی جھوٹ، فریب اور منافقت کی۔۔۔ یہاں سچ بولنے والے ہی گردن زدنی ٹھہرے ہیں اور اگر آپ تہیہ بھی کر لیں کہ ایک دن سچ بول کے گزارنا ہے، جھوٹ یا منافقت سے ہرگز کام نہیں لینا تو دن تو بڑی دُور کی بات، ایک گھنٹہ تک آپ نقصان کئے بغیر نہیں گزار سکتے۔''

''وہ کیسے؟'' سب نے اشتیاق سے پوچھا۔

''دیکھو، فرض کیا آپ تنخواہ نکال کر گھر آ رہے ہیں، کسی دوست کو بھی اس کی سن گن ہے۔ وہ آپ سے اُدھار مانگ لیتا ہے تو آپ سچ بول کر تنخواہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور جھوٹ بولیں گے تو عہد ٹوٹ جائے گا۔ اِسی طرح اگر کوئی باس اپنی جوان سیکرٹری کے ساتھ بھرپور میٹنگ کے بعد دیر سے گھر آتا ہے تو سوچو کہ بیگم کے استفسار پر سچ بولنے میں اس کو کس کس قسم کے خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ اِسی طرح کوئی طالب علم اگر سارا دن کھیل کود میں وقت برباد کر دے اور سبق یاد کرے اور نہ ہوم ورک کرے اور دوسرے دن استاد صاحب کے سامنے سچ بول دے تو اس سچ کا خمیازہ اسے کتنا بھگتنا پڑے گا اور اگر ان سب کیسوں میں جھوٹ اور منافقت سے کام لیا جائے تو اکثر کوئی مسئلہ پیدا ہی نہ ہوگا اور تو اور، لڑکے اور لڑکی والے ایک دوسرے سے سچ بولیں تو رشتہ جڑنے کی نوبت ہی نہ آئے اور اگر عاشق اور محبوبہ ایک دوسرے سے سچ بولیں تو ان کا تعلق بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے۔ مجرم سچ بولنے لگ جائے تو ملک میں پولیس اور عدالتوں کی ضرورت ہی نہ رہے اور وکیل بھوکے مر جائیں۔''

''حضرت آپ آج بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ پہلے طوائفوں کی حمایت کی اور اب جھوٹ اور منافقت کی حمایت کر رہے ہیں۔'' میں نے عرض کی ''آپ کو ہو کیا گیا ہے۔''

''میرا دماغ الٹ گیا ہے کیونکہ میں نے کلین شیو اداکاروں اور میک اپ زدہ اداکاراؤں سے دین سیکھا ہے۔''

''لیکن اِن پروگراموں میں تو علمائے دین بھی شریک ہوا کرتے تھے۔'' ایک اور مرید نے کہا۔

''کاش وہ اِن پروگراموں میں شریک نہ ہوتے۔ اُنھی کی وجہ سے تو اِن پروگراموں کو ایک قسم کی سند بھی مل گئی۔ بے پردہ مخلوط پروگرام میں انہوں نے اپنی نظر کو کیسے بچایا ہوگا اور اسلام کے بنیادی حکم پردے کو توڑ کر اور نامحرموں سے اختلاط کے بعد اِن بیبیوں نے جو تبلیغ کی ہوگی، نجانے اس کا ثواب ہوگا یا گناہ، اسلام نے تو عورت کو نامحرم کو آواز تک سنانے سے منع کیا گیا ہے جبکہ یہ بیبیاں تو میک اپ کر کے سکرین پر نعتیں پڑھتی ہیں اور پر سے ٹی وی کے تنخواہ دار مولوی جنہوں نے اللہ اور بندے کے درمیان معاملے یعنی عبادت کو بھی پوری دنیا میں تشہیر کا ذریعہ بنا لیا۔ افسوس کہ ان کمرشل چینلز نے دین کو بھی کمرشل کر دیا اور عوام نے عبادت کے اوقات بھی ٹی وی کے آگے بیٹھ کے ضائع کر دئے۔ اسلام نے تو ریاکاری کو شرکِ اصغر کہا کہ اس طرح بندہ اللہ کی بجائے بندوں کو دکھاتا ہے کہ میں بڑا پرہیزگار ہوں۔ ٹی وی کی تشہیر تو ریاکاری کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔''

حضرت کی طبیعت بے حد مکدر ہو گئی تھی، لہٰذا انہوں نے محفل برخاست کر دی۔

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آ رہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

چوکے

جدید دور

اب غزل کو بمع تصویر لگاؤ نیٹ پر
خواب کا وقت نہیں لمحۂ تعبیری ہے
لائقی کی جگہ اب ''لائیکی'' چلتی ہے یہاں
بھائی یہ دور تو تصویری و تشہیری ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سمارٹ جنریشن

پہلے سا رکھ رکھاؤ بھلا اب کہاں پہ ہے
رنگت تھی جس کی سرخ وہ اب ہے سفید خون
اسمارٹ فون لے کے وہ اسمارٹ ہوگئی
اب کیسے اس کا باپ اٹھائے گا ٹیلیفون

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ملاوٹ

دال میں کنکر، ثمر بے رس، دوائیں بے اثر
شر ہی شر ہے ہر طرف جائے کہاں بندہ بشر
ہر غذا میں ہے ملاوٹ توبہ توبہ اس قدر
''چائے کی پتی سے کٹ سکتا ہے بندے کا جگر''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ساس

آمد و رفت میں تعطل پر
کیا کریں ہم جو ہوں نہ جذباتی
سانس آتی ہے، سانس جاتی ہے
ساس آتی ہے پر نہیں جاتی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فریبی لیڈر

بھیس میں رہبر کے، پیہم رہزنی کرتے رہے
کھا گئے ملکی خزانہ لُوٹ کر، ڈاکو بنے
اپنے لیڈر خر ہیں پر عیّار مانندِ شغال
مُرغ کو وہ مُرغ بولے اور اذاں دینے لگے

تنویر پھوؔل

اسلامی کانفرنس

سُشما کو کیا "اسما" سمجھا اور "سُوراج" کو بھی "معراج"
"او آئی سی" پر حیرت ہے، ماری گئی پھوؔل! ان کی مت
عقل کی موٹی بھینس ہے اُنکی اس سے کہہ دو گھاس چرے
کانفرنس اسلامی، اُس میں آئے گی مشرک عورت؟

تنویر پھوؔل

ایک معمولی مرغی چور کی گرفتاری پر

ڈاکو ہیں سردار تمھارے، اُن پر ہاتھ نہ ڈالو گے!
عدل کے آئینے کو تم نے کالا کر کے توڑ دیا
ڈالر مہنگا کر کے مروڑی سارے غریبوں کی گردن
مرغی چور کو تم نے پکڑا، ہاتھی چور کو چھوڑ دیا!

تنویر پھوؔل

سیاسی اچار

افغانیوں سے ملنے گئے ہیں وزیرِ پاک
وہ چین جا کے اُن سے جتائیں گے اپنا پیار
ایران بھی وہ جائیں گے، آخر میں رُوس بھی
پہلے حروف لے کے بنائیں گے وہ "اچار"

تنویر پھوؔل

عدالت کا فیصلہ

ملی مہلت ہے زرداری کو اور فریال کو یارو!
ہُوا ہے فیصلہ تازہ یہ ملت کی عدالت میں
زمانے کی ہے نیرنگی کہ شہباز و نواز آئے
"شرافت" مجتمع ہے پھوؔل! دیکھو کوٹ لکھپت میں

تنویر پھوؔل

جل گئی رسّی

مارا ہے شب خون زرداری نے قومی مال پر
تھے شریکِ جرم فریال و بلاول، پھنس گئے
پھولؔ ! دیکھو چیخنا، چلّانا، دینا دھمکیاں
جل گئی رسّی، عبث ہے اس کا یہ بل، پھنس گئے

تنویر پھولؔ

موذی مودی

پاک وطن کو تُو نے گھورا، آنکھیں تیری پھوڑیں گے
اس کو مت گجرات سمجھنا، ہوش میں آجا تُو مودی!
دہشت گردوں میں شامل تھا، یو این او کو یاد رہے
''ظلم'' کا نقطہ ''مودی'' پر، بن جاتا ہے وہ موذی

تنویر پھولؔ

بھارتی طیارہ

وادیٔ کشمیر میں ڈھاتے ستم ہیں بار بار
بچہ بچہ ظالموں کے آگے ، دیکھو ! تن گیا
پار سرحد کر کے آئے ، وہ زمیں پر آ رہے
لائے جو طیارہ جنگی، اُن کا چرغا بن گیا

تنویر پھولؔ

سوتیلی مرغیاں

لوگ اب کہنے لگے ہیں، ان کو کھانا ہے عبث
وہ ہیں ناقص، اس لئے بہتر ہے، کھانے سے بچیں
وہ ''حقیقی'' مرغیاں ہیں جو ہیں دیسی مرغیاں
فارمی جو مرغیاں ہیں اُن کو ''سوتیلی'' کہیں

تنویر پھولؔ

کچھ تو خیال کر

اِس عمر میں یہ حرکتیں جچتی نہیں تجھے
تیری کمر کمان ہے، کچھ تو خیال کر
اب مہ رُخوں سے دوستی اچھی میاں
بچہ ترا جوان ہے کچھ تو خیال کر

ش۔م۔عالمؔ

ناز کا انداز

نازوں سے مجھ کو پالا ہے ابّا حضور نے
پورا اُنھوں نے میری ہر اک بات کو کیا
امّاں کسی کو میں نے کہا گر تکلفاً
فوراً اُسے نکاح کا پیغام دے دیا

ش۔م۔عالمؔ

ہم اور ہمارے گھوڑے

دشت و دریا تھے کبھی جن کے سموں سے پامال
اب وہ اِس موجِ خرابات میں کب دوڑتے ہیں
بحرِ ظلمات میں دوڑے تھے تمہارے گھوڑے
اپنے گھوڑے تو سرِ ریس کلب دوڑتے ہیں

ش۔م۔عالم

چاند

پہلے بیگم! چاند کہتی تھی مجھے تم عید کا
اب تمھیں کیوں پیار پہلے کی طرح آتا نہیں؟
بولیں بیگم چاند وہ تو جھریوں میں چھپ گیا
اور جو اُبھرا ہے سر پر وہ مجھے بھاتا نہیں

ش۔م۔عالم

امرِ حیرت

امرِ حیرت ہے، عقد کر کے بھی
تیرا افسردہ خودی کا خوگر ہے
''عزت افزائیوں'' پہ کیوں ہے خجل
یہ تو شادی شدوں کا زیور ہے

نوید ظفر کیانی

استدعا

بہت سے صاحبِ دیوان شعراء کی طرح کیا آئی
افادے میں مرے اشعار بھی بیکار ہیں کچھ تو
مرے دیوان کو بھی گود لے لے پبلشر کوئی
مری تکبندیاں بھی داد کی حقدار ہیں کچھ تو

نوید ظفر کیانی

تاسف

رُل گئے جو کالجوں میں مجھ سمیت
عمر بھر رسوا پئے روزی ہوئے
ہاتھ مارا ہے جنھوں نے عقل کو
ڈاکوؤں کے گینگ میں بھرتی ہوئے

نوید ظفر کیانی

معیشت

پوچھو نہ احوالِ معیشت!
بنا ہوا ہے یکسر قیمہ
کب ایسے برباد ہوئے تھے
ناگا ساکیؔ ہیرو شیما

نوید ظفر کیانی

میں اور میرا سرجری وارڈ

کرن خان

آج صرف ایک رات کے لیے یہ بیڈ میرا تھا کیونکہ کل آپریشن تھا میرا اور اس کے بعد میرا ٹھکانہ سرجری وارڈ میں بننا تھا۔

اِس وارڈ میں تقریباً میری ہی لسٹ کے وہ مریض تھے، جن کی کل کسی نہ کسی صورت سرجری ہونی تھی۔ میں باری باری سب کے بیڈ پر گئی، سب سے دعا سلام کی اور جا کے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ موبائل آن کرلیا اور کیا کرتی۔۔۔امی جی البتہ اپنے جیسی اور امیوں کے ساتھ اپنی اپنی اولاد کا دکھ شیئر کرنے لگیں جو ان کے چہروں پر ثبت تھا۔

میں نے انہی دنوں یہ مشاہدہ کیا کہ دکھ درد کے دِنوں میں بننے والے رشتے بہت مضبوط ثابت ہوتے ہیں۔ان لوگوں کے درد ساجھے ہوتے ہیں۔۔۔یہ لوگ ایک دوسرے کا درد بانٹتے ہیں اور ایک دوسرے کو دلاسے بھی یہی لوگ دیتے ہیں۔دو دن رہیں یا دس دن۔۔۔ایک قلبی رشتہ بہرحال وارڈ میں ایک دوسرے سے بن جاتا ہے۔

مجھے باہر کاؤنٹر پر طلب کیا گیا۔امی میرے ساتھ آنے لگیں، میں نے منع کردیا ”آپ بیٹھو۔۔۔ ابھی نہیں ہو رہا آپریشن۔میں پتہ کرآتی ہوں ویسے بھی آپ تھکی ہوئی ہیں۔“

امی بادل ناخواستہ بیٹھ گئیں اور میں باہر چل دی۔کاؤنٹر پر ایک نرس میری منتظر تھی، ساتھ ہی ابو بھی کھڑے تھے۔میں ان کے

پاس پہنچ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

نرس نے کچھ کاغذات کا پلندہ سا میرے سامنے رکھا اور قلم پکڑایا۔اشارہ دیا کہ سائن کرو۔

ابو کے چہرے پر تھوڑی سی پریشانی نظر آرہی تھی لیکن میری خاطر وہ والی مسکراہٹ دکھا رہے تھے جس میں حوصلہ افزائی ہو۔

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تحریر پر نظر ڈالی۔دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''میں اپنے ہوش و حواس میں سرجری کی اجازت دیتی ہوں۔مجھے آپریشن سے متعلق تمام نقصانات سے آگاہ کر دیا ہے۔دوران آپریشن زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے میری موت ہو جائے یا مجھے ہوش ہی نہ آئے تو عملہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔''

نیچے میرے ابو کے دستخط موجود تھے۔میں نے دھواں دھواں چہرے سے ابو کو دیکھا۔

ابو کچھ الفاظ ترتیب دے کر بولے ''یہ فارمیلٹی ہوتی ہے۔چھوٹے بڑے سب آپریشنز میں سائن کر دو اور اپنی امی کو مت بتانا۔۔۔پریشان ہوگی۔''

مجھ سے نظریں چرا کر بات کی۔میں نے چپ چاپ سائن کیے۔پہلی بار اس طرح کے دستخط جنھوں نے دل میں خوف بھر دیا۔میں نے ابو کو اشارہ کیا، پیاس لگی ہے پانی لا دیں۔ابو سر ہلا کر چل دیے۔

میں نرس کی طرف متوجہ ہوئی۔ایک سوال جو کہ اب ضروری تھا۔

''میرا آپریشن مائنر ہے یا میجر؟'' چہرہ بے تاثر بلکہ بے خوف بنانا پڑا تا کہ وہ آرام سے بتا دے۔

نرس نے میری رپورٹ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور پیشہ وارانہ مہارت سے تین لفظی مختصر جواب دیا ''میجر سرجری ہے۔۔۔''

اب میرا گھبرانا فطری عمل تھا اور بے یقینی سے نرس کو دیکھنے لگی۔نرس غالباً میرے تاثرات بھانپ گئی اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ہولے سے دبایا ''پریشان ہونے کی بات نہیں ۔۔۔کمپیوٹرائز ٹانکے ہوں گے۔۔جو کہ انٹرنل لگے ہوتے ہیں ۔۔۔ایکسٹرنل سکن پر نظر نہیں آئیں گے۔''

میں نے بمشکل سر ہلایا اور قدموں کو گھسیٹتی ہوئی واپس چل پڑی۔مزید کیا پوچھتی، ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔آگہی کا جتنا عذاب ملا تھا، کافی تھا۔

وارڈ میں داخل ہونے سے پہلے خود کو کمپوز کیا، چہرے پر بشاشت سجانے کی کوشش کی اور بیڈ پر آ گئی۔امی نے وجہ پوچھی، ان کو مطمئن کیا کہ ابو نے بلوایا تھا۔اب ایک بات تو طے تھی ۔۔۔مجھے نیند نہیں آنی تھی۔

کچھ دیر پہلے حالات مختلف تھے لیکن اب یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔مجھے فی الحال کسی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ''آبدی پئی تے بئ دی وسری'' (اپنی پڑی دوسروں کی بھول گئی) والی صورت حال تھی۔

ابو جوسز اور فروٹ کیک وغیرہ لے آئے۔ایک عدد رسالہ بھی ہاتھ میں تھا، مجھے تھمایا۔امی کو کچھ انسٹرکشنز دیں۔۔۔اور مجھے

اس کم بخت ٹاور سے سیدھی سادی جمپ لگانی ہو تو کوئی بھی مشکل پیش نہ آئے۔انسان آنکھیں میچ' خدا کا نام لے' ہرچہ بادا باد کا نعرہ لگاتے ہوئے جمپ کر ہی جائے لیکن اس بلندی پر پہنچ کر جب کہ انسان کی سٹی ویسے ہی گم ہوئی ہوتی ہے۔حکم یہ ہے کہ ٹاور چھوڑتے ہوئے آنکھیں کھلی ہوں' پنجے ملے ہوں' بازو پہلوؤں سے جڑے ہوں' گردن جھکی ہو اور ہاتھ ریزرو پیراشوٹ پر دھرے ہوں۔ایک آدھ حکم ہو تو انسان یاد بھی رکھے' اتنی بہت سی چیزیں یاد رہیں تو کیونکر؟ ہمیں تو گھر والے دو سے زائد سبزیاں لانے کو کہہ دیں تو اچھا بھلا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے کہ آلو کی جگہ کچالو' مٹر کی جگہ مکئی اور ٹنڈوں کی جگہ بھنڈیوں کا آ جانا معمول کی بات ہے۔گھر میں جھگڑا شروع ہو تو ہم یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم لا چکے' وہی کچھ لانے کا حکم ملا تھا ہمیں۔ **جنٹلمین بسم اللہ از کرنل اشفاق حسین**

ایک دفعہ جون ایلیا نے اپنے بارے میں لکھا کہ میں ناکام شاعر ہوں۔
اس پر مشفق خواجہ نے انہیں مشورہ دیا "جون صاحب! اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہاں اہلِ نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرنے کے باوجود، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔"

آخر میں ہدایت دی کہ رات بارہ بجے کے بعد کچھ نہ کھانا۔ میں نے فرمابرداری سے سر ہلایا۔۔۔اب ابو چلے گئے۔

میں نے رسالہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ امی نے ابو کا لایا ہوا کھانا کھایا اور میری ہدایت پر سونے کی کوشش کرنے لگیں کیونکہ مجھے تو نیند پتہ نہیں کب آتی۔

میری پڑھتے پڑھتے بے خیالی میں سامنے والے بیڈ پر نظر پڑی اور نظر پڑتے ہی میں اچھل پڑی۔ اس بیڈ کی مریضہ اپنے بیڈ پر بیٹھی میری طرف گھور رہی تھی۔ میں نے پہلے تو اشارے سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے؟

وہ بدستور چپ۔۔پلکیں بھی نہ جھپک رہی تھی۔۔۔میں نے دل میں سوچا "یا اللہ یہ عورت ہے کہ سانپ۔" اور پھر سونے کی اداکاری کی۔ لیٹ گئی۔ عورت اب دیوار کو گھور رہی یعنی اس کا مرکز میں نہ تھی۔ یہ تو تسلی ہوئی۔

اِتنے میں اس کی کوئی رشتے دار اندر آئیں، اس کو پکڑ کر سلا دیا۔ یہ محترمہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے سو گئیں۔ میں اٹھ بیٹھی۔ تجسس تھا کہ اس کو کیا مرض ہے آخر؟ آنٹی سے دریافت کیا۔ آنٹی بولیں "بیٹا اس کا کل پتے کا آپریشن ہے۔"

میں نے پوچھا "اور کیا ہے اس کو؟"

بولیں "کچھ بھی نہیں، بس پریشان ہے۔"

مجھے دل ہی دل میں سخت غصہ آیا "لوحد ہے پتہ کے آپریشن میں اس درجہ صدمے کی کیا ضرورت ہے۔ پتہ ہی تو ہے اس کے بغیر کافی لوگ آرام سے رہ رہے ہوتے ہیں۔" اُن محترمہ کا صدمہ سمجھ سے باہر تھا۔

پڑھتے پڑھتے مجھے بھی درمیان میں کوئی ایک دو گھنٹے کی نیند آ گئی۔ کوئی چار بجے کے قریب جاگنا پڑا۔ وجہ ساتھ کے بیڈ والی محترمہ تھی، جن کو انجکشن نہیں لگوانا تھا اس سے ڈرتی تھیں۔

مجھے سخت برا لگا۔ دل چاہا اٹھ کر دو تھپڑ لگاؤں اور کہوں "الو کی پٹھی، صبح تمہارا پیٹ پھاڑا جائے گا اور اب اتنی سی تکلیف پر رو رہی ہو!"

لیکن خود پر کنٹرول کیا اور سپاٹ تاثرات چہرے پر جما کر اس کا تماشا دیکھتی رہی، جو اس نے ایک انجکشن لگنے پر اس نے لگایا تھا۔

نرس نے ناپسندیدگی سے اس کو ڈانٹا "چھوٹی بچی ہو کیا؟ نیند والوں کو بھی جگا دیا۔"

وہ چپ تو ہوگئی لیکن شرمندہ نہیں لگ رہی تھی۔

امی بھی جاگ چکیں تھیں۔ اب سونا بے سود تھا۔ اس لیے ہم ماں بیٹی نماز والے پورشن کی طرف چلے گئے۔

وہاں اور عورتیں بھی تھیں جو اپنی اپنی پریشانیاں لے کر اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز تھیں۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئیں۔

نوافل ادا کیے۔۔۔اذکار و تلاوت، دعائیں، التجائیں۔ اِتنے میں فجر کی اذانوں نے ایک خوب صورت سماں باندھ دیا۔ مسجد میں موجود سب عورتوں نے فجر پڑھی اور اپنے اپنے وارڈز کی طرف روانہ ہونے لگیں کیونکہ اب ڈاکٹرز کا راؤنڈ ہونا تھا اور آپریشن والوں کا بی پی وغیرہ چیک ہونا تھا۔

ہم بھی بیڈ پر آن موجود ہوئے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے آ کے سب کا بی پی چیک کیا۔ مجھے تب پتہ چلا میرا نمبر آخری یعنی پندرہواں تھا۔

آٹھ بجے ہم تمام مریضوں کو آپریشن تھیٹر کے باہر بنے ویٹنگ روم میں موجود ہونا تھا۔

ہمیں یہ ہدایت دے کر ڈاکٹر روانہ ہو گئے، یعنی ہوش و حواس کا ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی بچا تھا۔ آگے کیا ہونا ہے کچھ پتہ نہ تھا۔ میری خواہش ہو رہی تھی بیڈ ٹی کی۔ سوچ رہی تھی، اگر زندہ نہ بھی بچ پائی تو چائے کا بھی غم رہے گا کہ آخری دن نہ پی سکی لیکن کھانا پینا منع

تھا۔

ابو کو دیکھنا چاہتی تھی اور یہ خواہش پوری بھی فوراً ہوگئی کیونکہ ابو دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر بے مقصد سی باتوں پر ہنستے رہے۔

میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا '' کیا یہ میرا آخری دن تو نہیں؟''

لیکن اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ بار بار امی ابو کو غور سے دیکھتی، دل سیراب کرنا چاہتی تھی۔

باہر سے ایک بندے کی آواز آئی۔ ایک ایک مریض کا نام پڑھا جا رہا تھا اور بلایا جا رہا تھا'' چلو آپریشن تھیٹر۔۔۔''

سب مریض اپنی اپنی فائلیں اٹھانے لگے۔ ہم نے بھی وہی کیا اور اس بندے کی تقلید میں باہر روانہ ہوئے۔ یہ اور بات تھی کہ دل کی دھڑکن تھوڑی بے ترتیب ہو رہی تھی اور دل بار بار یوں ڈوبتا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہو جاتا۔ میرے لیے بلڈ کی دو بوتلیں بھی سیو کرائی گئی تھیں کہ بلڈ کی کمی ہے۔

اب سامنے خوب صورت سا کوریڈور آ گیا لیکن اِس انتظار گاہ میں صرف مریض کے اہل و عیال کو سولی پر لٹکنا تھا۔ ہمیں تو اندر جانا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں مجھے اپنی زندگی کا مشکل ترین کام کرنا تھا اور وہ تھا، الوداع کرنا۔۔۔ اِس امید پر کہ ہم واپسی پر زندہ ہوں گے۔

اب سب رُک گئے، اپنے اپنے پیاروں سے ملنے لگے۔ مجھے امی ابو سے ملنا تھا اور اس جگہ ان کو چھوڑ کر باقی سب کچھ اکیلے بھگتنا تھا۔ امی نے گلے لگایا، ماتھا چوما، کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ابو کو شاید پچھلوں کی کال آ رہی تھی کہ ہم آ رہے ہیں۔

اب ابو سے ملی۔ دل کانپ رہا تھا کہ میری طاقت تو یہ دونوں ہیں۔۔۔ اندر کیسے جاؤں اب؟؟

لیکن اور کوئی چارہ نا تھا۔

میں نے ابو سے اپنا رسالہ لیا۔ ایک بزرگ ڈاکٹر جو ہمارے انتظار میں تھے، مجھے اشارے سے منع کیا کہ یہ میگزین اندر نہ لے چلوں۔

سن سینتالیس کے فسادات کے زمانے میں کنہیا لال کپور لاہور میں تھے۔ جب بہت دیر تک گھر میں بند رہنے کی وجہ سے طبیعت گھبرائی تو وہ اپنے مخصوص ہوٹل کو چل دیے، جہاں اُن کے بہت سارے مسلمان ادیب دوست جمع تھے۔ وہ بہت دنوں بعد کپور کو دیکھ کر اشتیاق سے ملنے لگے، مگر کپور نے جملہ کسا'' بھئی، یوں تپاک سے کیوں مل رہے ہو، یہ سچ ہے کہ ایک زمانے کے بعد ایک کافر ہاتھ آیا ہے مگر ذرا اس کافر کی حالتِ زار بھی تو دیکھو، قتل کے بعد ایک قطرۂ خون بھی نہ نکلے گا، ناحق گھر جانے کے بعد بھائی صاحبان کہیں گی کہ کس رذیل کو قتل کر آئے کہ ہاتھوں کو خون تک نہیں لگا ہے۔''
اور اس کے ساتھ ہی لاہور کی وہ ادبی محفل قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

میں نے جواباً کہا'' کیوں؟ میرا آخری نمبر ہے تب تک کیا کرتی رہوں؟؟''

ڈاکٹر متانت سے گویا ہوئے'' بیٹا اس کی اجازت نہیں اور ویسے بھی یہ گم ہو جائے گا، اس کا خیال کون رکھے گا آپریشن کے بعد؟''

میں نے اپنے رسالے کو مضبوطی سے گلے سے لگایا'' یا مجھے پڑھنے کی اجازت دیں ورنہ ٹھیک ہے میں یہی بیٹھ کر انتظار کرلوں گی۔''

ڈاکٹر نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور کہا'' ٹھیک ہے، لے چلو لیکن چادر میں چھپا کر چلو۔''

میں نے الوداعی نظر ڈالی امی ابو پر اور اس نظر میں۔۔ بہت کچھ تھا، ماں باپ کے سمجھنے کے لیے۔ ہم اندر داخل ہوئے دروازہ بند ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلا احساس غیر معمولی سناٹے کا ہوا جس نے پورے جسم میں سنسنی دوڑا دی۔ ایسی معنی خیز خاموشی جو چپ چاپ زندگی کو موت اور موت کو زندگی میں بدلتے دیکھ رہی تھی۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی تقلید میں چپ چاپ مطلوبہ

ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم ”فن کار“ کے ایک شعر میں عرصہ گاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کسی نے اس لفظ پر اعتراض کیا تو ساحر نے ایک صاحب کی معرفت علامہ تاجور نجیب آبادی سے استفسار کیا۔ علامہ تاجور نے کہا ”اگر کسی دوست نے استعمال کیا ہے تو صحیح ہے، اگر کسی دشمن نے لکھا ہے تو غلط ہے، میں دونوں طرح ثابت کر سکتا ہوں۔“

منزل کی طرف روانہ تھے اور آخر کار ایک کمرے کے سامنے ڈاکٹر صاحب رُک گئے۔

ہمیں اشارہ کیا گیا کہ سب اس کمرے میں داخل ہو جاؤ۔ اس سے قبل کہ ہم اندر داخل ہوتے، دروازہ کھلا اور ایک بندہ سٹریچر کو گھسیٹ کر باہر نکلا۔ اس سٹریچر پر سفید چادر سے لپٹا ایک بے جان وجود دیکھتے ہی جسم میں کانٹے اُگ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیشنل انداز میں اس سے دریافت کیا کہ آپریٹ کامیاب ہوا کہ نہیں اور اگلے نے نفی میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے مزید کچھ نہ پوچھا اور نہ ہی اُس نے کچھ اور بتایا لیکن میں سمجھ گئی کہ پیشنٹ مر چکا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی رُک کر دیکھنے لگی۔ اس بندے نے سٹریچر کو ایک جگہ کونے میں لگا دیا اور خود شاید اس کی فائل لینے گیا۔ تاکہ اس کے وارثوں کو ڈھونڈ کر میت ان کے حوالے کی جائے۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس ڈیڈ باڈی کو دیکھا جائے۔ میں نے امید بھری نظروں سے اپنے ڈاکٹر سے پوچھا ”کیا میں وہ ڈیڈ باڈی دیکھ سکتی ہوں؟“

ڈاکٹر نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور کہا ”نو! آپ اندر چلیں۔“

شاید وہ یہ سمجھے ہوں گے کہ آپریشن سے پہلے ڈیڈ باڈی کو دیکھنے سے مجھ پر دہشت طاری ہو جائے گی۔ میں نے اندر داخل ہونے کے بعد آخری نظر اس باڈی پر ڈالی۔ یہ تھی انسان کی حقیقت! جو اب بے یارو مددگار اس گیلری میں پڑی تھی۔ خدا جانے اس کے گھر والوں کو کب بتایا جائے گا۔ ان پر کیا گزرے گی۔ گہرے دُکھ کے حصار میں گھر کر ایک کمرے میں داخل ہوئی جو کہ مریضوں کی انتظار گاہ تھی۔ اس کمرے میں بیٹھنے کے بعد چاروں طرف میں نے نظر دوڑائی۔ چھوٹا سا کوئی دس بائی دس کا کمرہ، چاروں طرف سرجری سے متعلق سامان پڑا تھا۔ کچھ بند کارٹنز بھی تھے۔ ویسے تو کمرہ ٹھیک تھا۔۔۔ پرسکون اور صاف ستھرا لیکن ایک چیز ڈرا رہی تھی اور وہ تھا سامنے شیشے کا بنا ہوا ڈور جو کہ ظاہری بات ہے آپریشن تھیٹر تھا۔

شیشے پر ٹیپوں کی مدد سے اتنا حصہ چھپایا گیا تھا جتنا انتظار گاہ میں بیٹھے مریض دیکھ سکتے تھے لیکن ہم جو سن رہے تھے اس کو دماغ میں آرام سے فلما بھی رہے تھے اور نتیجہ جھرجھری پیدا کر دیتا۔ ایک مشین کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔۔۔ ٹوں، ٹوں کی آواز۔۔۔ جو کبھی تیز ہو جاتی کبھی آہستہ۔۔۔ جب تیز ہوتی تو ڈاکٹرز کی تشویش بھری آواز بھی ساتھ میں سنائی دیتی اور آہستہ ہو جاتی تب بھی ڈاکٹرز کی پریشانی بھری آواز کانوں میں پڑتی تو میرے چہرے پر بھی پریشانی آ جاتی اور میں نے اندازہ لگایا کہ جب یہی آواز غالباً ایک نان سٹاپ ٹوں ں ں ں۔۔۔ میں بدل جاتی تب زندہ بندہ لاش میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

میں نے پریشانی سے بچنے کے لیے رسالہ کھول لیا کیونکہ یہ ماحول مجھے وحشت میں مبتلا کر رہا تھا۔ میرے ساتھ موجود مریضوں کا نمبر شروع ہو چکا تھا اور یہ شاید واحد جگہ تھی جہاں آگے جانے والا بھی پریشان تھا اور پیچھے بچ جانے والے کی بھی جان پر بنی ہوئی تھی۔ میرا نمبر سب سے آخری تھا اور اس سولی پر مجھے سب سے آخر میں لٹکنا تھا۔

میگزین پر تمام تر توجہ دینے کی کوشش میں ناکام ہو رہی تھی کیونکہ ماحول کا اثر تھا۔ آخر خود کو ریلیکس کرنا چاہا۔ رسالہ بند کیا اٹھ کھڑی ہوئی، لمبے لمبے سانس لیے اور کمرے مکس ادھر ادھر پھرنے لگی۔ میرے ساتھ کوئی آٹھ نو مزید عورتیں بچی تھیں۔ ان سے باری باری انٹرویو لینا شروع کیا۔ ایک دو ہمت والی لگیں بس۔ باقی سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ایک گاؤں سے دیہاتی عورت سب سے زیادہ پریشان لگی۔ اس کا مسئلہ پوچھا تو پتہ چلا رسولی تھی پیٹ

میں۔ میں نے سمجھایا کہ کچھ نہیں ہوگا۔اس کا خوف پھر بھی کم نہ ہوا۔شاید میرے الفاظ کھوکھلے تھے۔میں ان کا خوف کیسے کم کرتی یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔تنگ آکر میں نے دوبارہ میگزین کھولا۔اب تھوڑا کمپرومائز کرچکی تھی، لہٰذا پڑھنے میں دشواری نہ ہوئی اور کچھ دیر میں ہی میں اس جگہ سے قطعاً بے نیاز ہوچکی تھی اور اتنی گم ہوئی کہ میری باری آگئی تب پتہ چلا۔ڈاکٹر صاحب نے مخاطب کرکے بلایا، تب چونک کر میں نے اردگرد دیکھا۔دل کی دھڑکن گڑبڑا گئی، اٹھنے لگی۔دیوار کا سہارا لینا پڑا کیونکہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔موت کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا، اچھے اچھوں کی بولتی بند ہوجاتی ہے اور اس بات کا بخوبی احساس ہورہا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر میری ہمت بڑھائی ''ہاں تو بیٹا آپ کا ناول ختم ہوا؟'' اگلا جملہ شرارت سے بولے'' یا ہم انتظار کرلیتے ہیں پہلے ختم کرلو پھر کرتے ہیں آپریشن۔''

میں نے بدقت اُن کو مسکرا کر دیکھا اور اپنے ازلی انداز سے کہا ''نہیں سر، ختم تو نہیں ہوئی سٹوری لیکن یہ سوچ لیں کہ مجھے آپریشن کے بعد پڑھنی ہے، لہٰذا زندہ اٹھایئے گا۔اگر مر مرا گئی تو اینڈ ختم نہ پڑھنے کا غم رہے گا۔''

ڈاکٹر صاحب نے تسلی کرائی اور مجھ سے رسالہ لے لیا کہ یہ آپ کی امانت ہے میرے پاس۔اور اس کے بعد مجھے اس آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔اندر داخل ہوتے ہی پتہ چلا۔یہ جا ہے ٹی وی میں دیکھو یا لائیو، دونوں صورتوں میں خوفناک ہوتے ہیں۔ایک بڑا سا بیڈ، جس کے اوپر لائیٹس کا گچھا سا بنا تھا۔بڑی بڑی مشینیں، جو شاید دورانِ آپریشن مریض کی زندگی کا حساب کتاب رکھتی تھیں کہ کتنی اختیار میں ہے اور کتنی نہیں۔

مشینوں کے بغور معائنے میں مشغول تھی، یہ بھول گئی کہ آپریشن بھی ہونا ہے ابھی۔سو ایک ڈاکٹر نے کھنکار کر میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔میں نے گھبرا کر اُن کو دیکھا۔ان کے چہرے پر دوستانہ سی مسکراہٹ اور آنکھوں سے اشارہ دیا کہ میں بیڈ پر دراز ہوجاؤں۔اِس مسلسل آزمائش سے میرے حواس بھی شل ہوچکے تھے۔زندگی یا موت کچھ بھی دیں لیکن انتظار جان لیوا تھا۔میں چپ چاپ بیڈ پر چڑھی اور لیٹ گئی۔اوپر بڑے بڑے بلب لگے تھے۔تمام تر ہمت کے باوجود یہ خوف رگ و پے میں سرایت کررہا تھا کہ زندہ اٹھوں گی یا ڈیڈ باڈی میں تبدیل ہوجاؤں گی۔ایک ڈاکٹر نے میرے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے پر ایک چمٹی ٹائپ پرزہ لگایا اور پیچھے سے ایک مشین نے ٹوں ٹوں کی شکل میں گواہی دی کہ مریض ابھی زندہ ہے۔

''میرے دوست۔''میں نے دل میں دعا کی ''اے مشین یہی ٹوں ٹوں ہی کرنا آواز نا بدلنا تو بس۔''

ایک بڑے سارے انجکشن کے ساتھ ایک اور فی میل ڈاکٹر حاضر ہوئی۔اس انجکشن میں سفید محلول تھا۔مجھے شک پڑا شاید اینستھیزیا ہے۔اور میرا شک درست ثابت ہوا۔اس نے میرے ہاتھ پر لگے برنولے میں یہ محلول منتقل کرنا شروع کردیا اور میں سوچنے لگی کہ کلمہ پڑھ ہی لوں۔ پڑھ لیا۔امی ابو بہن بھائیوں کے چہرے یاد کرنے لگی ایک بات ذہن میں آئی تو ڈاکٹر سے آہستہ سے بولی ''جب تک میں بے ہوش نہ ہوجاؤں کاٹنا پیٹنا شروع نہ کرنا۔''

ڈاکٹر صاحبہ ہنس پڑی۔سر بھاری ہونے لگا۔منظر دھندلانے لگا اور اس کے بعد دنیا مافیا سے بے خبر ہوگئی اور وہ تجربہ کیا جسے سائنس ''near death experience'' کہتی ہے۔

(جاری ہے)

کرن خان کا تعلق بہاولپور سے ہے۔فی الحال حصولِ تعلیم میں مگن ہیں۔سیاسیات اِن کا مضمون ہے۔کہانیاں لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے جو عموماً فکاہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔پیشہ ور ادیبہ بننے کی لگن ہے۔اِن کی کہانیاں عموماً طویل ہوتی ہیں لیکن ایسی جامعیت سمیٹے ہوتی ہیں کہ طوالت کے باوجود پڑھنے والا ایک ہی نشست میں پوری کہانی پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔طرزِ تحریر خاصا شستہ وشگفتہ ہے۔نہایت بے تکلفی سے ہر بات کہہ جاتی ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ اِن کی اوّلین کاوش ہے جو قسط وار شائع کی جارہی ہے۔

مگر فومی، تیرے پیر صاحب تو تجھ سے عمر میں کافی چھوٹے تھے؟'' میں نے حیرت سے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے دیوار پر لگی تصویر کو معنی خیز انداز میں گھورنا شروع کیا۔ اِس تصویر میں ایک عورت نے شیر کو چت کیا ہوا ہے اور وہ شیر زمین پر لیٹا عورت کو معصومیت سے دیکھ رہا تھا۔

اچھا۔۔۔پیر والی بات بعد میں کرتے ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ، یہ زمین پر لیٹا شیر عورت کو محبت سے دیکھ رہا ہے یا خوف کے باعث مجبوری میں تک رہا ہے؟ تم بتاؤ!'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''میرے خیال میں یہ اُس عورت کے حسن سے متاثر ہوا ہے اور اسی لئے وہ ''ہار'' بھی مان چکا ہے آج کل کے دل پھینک مردوں کی طرح، ورنہ شیر شیر ہوتا ہے اور نازک اندام عورت جتنی بھی دلیر ہو طاقتور ہو ''جھانسی کی رانی'' ہی کیوں نہ ہو، وہ شیر کے ساتھ پنجہ آزمائی نہیں کرسکتی۔ امریکہ میں محض عورت کو ہرانے کے لیئے ہیلری کو پسندیدہ امیدوار ہونے کے باوجود صدارت سے دور رکھا گیا اور امریکہ کی دوسوسالہ تاریخ میں ایک بھی عورت کو صدارت نہیں سونپی گئی ورنہ۔۔۔ ویسے بھی دنیا کے سات آٹھ ممالک ایسے ہیں جہاں عورت کو حکمرانی سونپی گئی۔''

''ہمیشہ کی طرح مظفر تمھاری یہ منطق بھی قابل غو رہے۔۔۔ بے خیالی میں تم کبھی کبھی ایسی ''عقل'' مندی کی باتیں کر جاتے ہو۔ حالانکہ عام گفتگو میں تم۔۔۔!''

مجھے پتہ ہے وہ میری باتیں سنتی ہے انہیں انجوائے بھی کرتی ہے مگر درپردہ اُس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی سازش یا دونمبری ضرور چل رہی ہوتی ہے۔ بظاہر وہ ایسی عورت نہیں لگتی مگر ہم اِک سازشی زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں نے مسکرا کر بات پھر شروع کی ''فومی'' عورت کی آزادی کے تم بھی حق میں ہو لیکن تمھاری وہ ''خواہش'' بھی مجھے ابھی تک یاد ہے۔ تم اکثر مجھے کہتی ہو کہ میرا کسی چینل پر انٹرویو کرادو، میں عورتوں خاص طور پر نو عمر

لڑکیوں کو یہ باور کروانا چاہتی ہوں کہ ''عورت کو مرد سے ایک دو Step نیچے ہی رہنا چاہیے!''

''ویسے یہ قابلِ توجہ ہی نہیں، تمھارے اِس Point of view پر میرے پاس دلائل موجود ہیں اور خواہش تو ہے ہی!'' جو عورتیں خوامخواہ مرد سے ہر میدان میں برابری کرنے کی خواہش رکھتی ہیں اور کوشش میں لگی رہتی ہیں کہ مرد کو نیچا دکھایا جائے وہ دراصل اِک ناکام شادی شدہ زندگی کی بنیاد رکھ رہی ہوتی ہیں'' فومی نے میری اِس بات کی کچھ مزید وضاحت کر دی۔

''ہاں تو تم کہہ رہی تھیں ''مجھے اپنے پیر صاحب سے محبت تھی؟''

وہ پھر کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ سے بولی ''مظفر، مجھے اب بھی اپنے پیر صاحب سے شدید محبت ہے۔''

''محبت بار بار تو نہیں ہوتی'' اس نے بے خیالی میں کہہ دیا اور میری ہنسی نکل گئی۔

''ویسے وہ ہے اسی قابل کہ اُس سے محبت کی جائے۔۔۔وہ لاہور کی کسی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کر رہا تھا، ہوگئی مکمل ڈگری؟''

''ہاں ہاں، پچھلے مہینے کانووکیشن میں اُسے ڈگری ملی تھی ۔۔۔ایک مہمان ساتھ لے جانے کی اجازت تھی، وہ مجھے ساتھ لے کر گیا تھا وہ اُس دن بھی بہت پیارا لگ رہا تھا۔''

''اور تم؟'' میں نے حسب عادت لقمہ دے دیا'' ویسے جب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ U.E.T میں ڈگری کلاسز میں ہے۔ میں اُسے سائیں سمجھتا تھا۔ جیسے اسے اپنے اردگرد کی خبر نہ ہو۔۔۔ کیسے گزارے گا، یہ اپنی زندگی میں اکثر سوچتا تھا۔''

اُس کی ہنسی نکل گئی ''بُری بات!'' وہ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولی ''ویسے ہم دونوں گھنٹوں تمہارے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اُس کی خواہش ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ دن گزارے کسی طویل ویران دنیا کے سفر پر بھی جائے۔''

''لیکن ''حسین وجمیل'' مرد کے ساتھ ساتھ وہ ایک ''مالدار پارٹی'' بھی تو ہے ناں!'' موٹی سامی'' کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

اِس دوران میری نظریں اُس کے چہرے پڑیں اور ''آنکھوں آنکھوں میں'' میری اس بات پر فومی سنجیدہ ہوگئی یا شاید گھبرا گئی۔

''اے تاج بی بی۔۔۔کدھر مر گئی اے۔۔۔کیا کہہ کر گئی تھی ۔۔۔بی بی جی تازہ کڑک چائے لاتی ہوں! اس حرامی تاج بی بی کو میں نے اب فارغ ہی کر دینا ہے!'' وہ گرجی۔

یہ فومی کا انداز تھا۔ جب بھی اُسے کوئی بات بُری لگتی یا اسے پسند نہ آتی یا پھر وہ کنی کترانا چاہتی تو کمال مہارت سے بات بدل دیتی یا کوئی ایمر جنسی ڈال دیتی یا پھر بدتمیزی پر اُتر آتی۔ بھارتی ڈراموں کی ''کھرانٹ'' قسم کی بڑی بوڑھیوں کی طرح، جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو ہی قتل کروا ڈالتی ہیں یا فیملی کے خلاف بھی سازش کرتے ہوئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتی ہیں اور ہماری پاکستانی عورتیں ''میری طرح'' نہایت سنجیدہ انداز میں ایسے ڈراموں کو سارے کام چھوڑ کے توجہ سے پوری طرح دل سے Intrest لیتے ہوئے دیکھتی ہیں اور دل پر ایسے ڈراموں کا اثر بھی لیتی ہیں، پرانے انڈین گانوں کی طرح جو نوعمر لڑکے لڑکیوں کی کئی بار خودکشی کا باعث بنے۔ میں نے اپنی نوعمری میں خاص طور پر دیکھا کہ چالاک عورتیں رات کو زیادہ Active ہوتی ہیں۔ اُن کے اندر کا شیطان شام کے بعد پوری طرح سے بیدار ہو جاتا ہے۔ قسمت والے ہی بچ پاتے ہیں ایسے موقع پر۔

شیخ زید ہسپتال کے پاس اِک رات ڈیڑھ بجے دو لڑکیاں بڑی سی نئی گاڑی میں اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ اِک چھوٹی سی گاڑی والا لڑکا اُن کے ہتھے چڑھ گیا۔ نوعمر حسین جمیل ڈرائیور لڑکی نے اُس بے چارے کی گاڑی سے بار بار اپنی گاڑی ٹکرائی۔ اُس بیچارے کی مت ماردی۔ بالآخر بیچارے نے گاڑی سائیڈ پر لگائی اور اُتر کر درختوں کی طرف بھاگ نکلا۔ اُس بیچارے نے سوچا ہوگا یہ لڑکیاں نہیں چڑیلیں ہیں جو رات کو لڑکی کے روپ میں مٹر گشت پر نکلی ہیں۔

''فومی اِک بات تو بتاؤ؟ یہ چڑیلیں یہ ڈائن جو ہوتی ہیں یہ عورت کا ہی روپ کیوں دھار لیتی ہیں۔ کیا ان چڑیلوں اور ڈائنوں کے ہاں مردانہ ''فورس'' نہیں ہوتی؟ ویسے آج کی نئی نسل

اِن چڑیلوں اور ایسی ہی مخلوقات سے بالکل بھی تو نہیں ڈرتیں۔ کسی خوف کا شکار نہیں ہوتیں۔۔۔جبکہ ہماری جوانی کے دور میں چڑیل کا ذکر آتے ہی لڑکیاں کانپنے لگتی تھیں اور ممی ڈیڈی قسم کے لڑکے گھبرا جاتے تھے۔''

میرے اس سوال کو اُس نے اَن سنا کر دیا۔وہ جیسے ابھی تک پیر صاحب کے بارے میں دیئے گئے بیان پر ہی غور کر رہی تھی اُسی دوران۔شور سا مچا۔

''ہو ہائے'' کیا ہوا!''آنکھیں کھول کے کام کیا کرو۔۔۔جو بھی ملتا ہے اِک دم'' جاہل''،گنوار۔۔۔بدنیت لوگوں سے میرا پالا پڑ گیا ہے۔سارے ہی جاہل فلسفی میرے ہاں اکھٹے ہو کر آ گئے ہیں۔''

وہ اِدھر اُدھر تیز تیز قدموں سے چل پھر رہی تھی اور بولتی چلی جا رہی تھی۔

تاج بی بی جلدی کے چکر میں چائے کی ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔تو ٹھوکر لگنے سے وہ خود بھی گری اور ٹرالی میں موجود چائے بھی۔۔۔برتن الگ سے چکنا چور ہو گئے۔

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

دوسری لڑی

عنصر شبیر

بے وقوفوں کا گروہ

چلتے ہو تو کے-ٹو کو چلئیے

اِن کا نام ہے ''کرنل منور حسین'' آرمی ریٹائرڈ ہیں، ایک مرتبہ ''کے-ٹو'' بیس کیمپ تک دوران ڈیوٹی سفر کر چکے ہیں۔ ہینڈسم سواچھ فٹ لمبے، مضبوط ڈیل ڈول والے مکمل طور پہ فٹ سیدھی کمر والے کرنل صاحب اُن افراد میں آتے ہیں جو ''عمر چور'' ہوتے ہیں۔

کرنل صاحب کے دائیں ہاتھ صوفے پہ میرا جگری یار ''میاں طارق'' براجمان ہے جو کہ اس ''بیوقوفوں کے گروہ'' کا خالق ہے۔ مجھ سے قد میں ذرا سا گھٹنا اور جسامت میں مجھ سے ذرا نہیں ''بہت زیادہ'' بھاری بھرکم، گول مٹول جسم کا مالک، پیشے کے لحاظ سے بینکار میرے ساتھ دو ہائیک کر چکا ہے۔

اُن کے ساتھ والی نشست پہ ''رشید صاحب '' آنکھوں پہ عینک سجائے، سر پر سے بالوں کو اڑائے، لمبوترے چہرے، گول مٹول مشکوک انداز کا پیٹ، پچکے سینے کے نیچے سجائے، لمبے قد باریک جسم لئے چیونگم چبائے چلے جا رہے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے بینکار ہیں میاں طارق کے آفس فیلو ہیں۔ ''ہائیکنگ کا تجربہ'' ایوبیہ سے نتھیا گلی تک نیشنل پارک کو پیدل طے کرنا ہے۔

اگلی نشست پہ ''بابر'' براجمان ہے۔ دُبلا پتلا اور پھرتیلا، چست اور گھٹے ہوئے جاندار جسم کا مالک، جو کہ تیز ہوا میں تناؤ میں آئی ہوئی کسی پتنگ کی طرح تنا ہوا بالکل سیدھا۔ یورپ میں پڑھائی کے دوران وہاں کے کسی ہائیکنگ کلب کے ساتھ بڑے بڑے ٹور کر چکا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے مقامی پرائیویٹ کالج کا مالک اور وہیں استاد بھی ہے۔

اسے اس سارے گورکھ دھندے کا دوسرا بڑا کھلاڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔

''رانا نذیر احمد'' یاروں کا یار، ہمہ یاراں جنت، ہمہ یاراں دوزخ کی عملی تصویر، خلوص و مہر و وفا میں گندھا ایک لاجواب دیہاتی پس منظر لئے لاجواب من کا موجی شخصیت۔ کوئی مشورہ لے لو،

جواب ملے گا ''جتھے گئیاں بیڑیاں، اوتھے گئے ملاح، بھا جی تسی بسم اللہ کرو۔'' پیشے کے لحاظ سے بابر کے کالج میں پروفیسر ہے اور ہائیکنگ کا تھوڑا بہت بابر کی ہی ہمراہی میں تجربہ رکھتا ہے۔

خالص لکھنوی بانکے کا سا انداز و اطوار اور زبان و بیاں لئے ایک لاجواب شاعر ''جناب مرزا عزت بیگ صاحب'' شکل ہی سے نازک اندام و نازک مزاج معلوم پڑتے، دبلے پتلے مرنجاں مرنج شخصیت، حیرت ہوئی کہ یہ بھی ''کے-ٹو'' جائیں گے؟ مگر تعارف پہ معلوم ہوا جناب بھی بابر صاحب کے کالج میں پروفیسر ہیں اور پچھلے سال ہی اُن کی ہمراہی میں ''نانگا پربت'' کے فیری میڈو سائیڈ سے بیس کیمپ پہ جا چکے ہیں۔ اللہ دیاں اللہ جانے ۔۔۔اللہ اللہ۔

اگلی شخصیت بڑی بڑی زومعنی آنکھوں کی چمک اور زبردست مسکراہٹ لئے ہوئے ہے ''جناب باقر رضوی صاحب''، پیشے کے لحاظ سے یہ بھی مقامی سرکاری کالج میں پروفیسر ہیں، مسلسل عینک اور سر پہ رکھی کیپ اُتار کر رومال سے پسینہ صاف کرتے ہیں اور بڑی احتیاط سے اپنے کم ہوتے ہوئے بالوں کو سیٹ کرتے ہیں۔ ہائیکنگ کا تجربہ اتنا ہے کہ مری کے مال روڈ پہ بغیر سانس لئے اور بغیر چھڑی پکڑے پورا آدھا چکر لگا سکتے ہیں۔ کیا تجربہ ہے ہائیکنگ کا، اللہ خیر تے بیڑے پار۔

خاموش طبع، خوش شکل، نوجوان، پراعتماد اور سر جھکا کے باادب بیٹھا ہوا ''عبدالحمید'' جو کہ اسلام آباد اور مری کے درمیان کسی چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کا رہائشی ہے۔ پنجابی اور انگلش بھی ایسے بولتا ہے کہ پکا ''پہاڑیا'' لگتا ہے اور اُردو بولے تو کیا کہنے۔۔۔آپ اسے اردو نہیں کہہ سکتے اور سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ کھلا ڈھلا مضبوط پہاڑی ہڈ پیر والا لمبے قد کا مالک۔ جناب بابر کالج میں طالب علم ہیں۔

اگلی شخصیت ''کے-ٹو'' ٹریک کے لحاظ سے انتہائی بلکہ خاصی مضحکہ خیز ہے۔ یہ بڑا پیٹ، پیٹ سے بڑا منہ، کہ جسے پورا دیکھنے کے لیے موٹر سائیکل درکار ہو، یہ موٹے موٹے بازو اور ٹانگیں، ہنستا ہے تو جیسے ساری خدائی ہنستی ہو، کہ گوشت کی پہاڑ میں زلزلہ کی

شدت ریکٹر سکیل پہ اس وقت کسی صورت ۱۲ سے کم نہ ہو، یہ ہیں ''بلال بٹ صاحب''، بابر کے کالج میں طالب علم ہیں۔ ہائیکنگ کا تجربہ اپنے بیڈروم سے اپنے گھر کے گیری تک پیدل چلنے کا ہے، وہ بھی بغیر سہارے کے۔ اوئے میاں طارق! اے کی کی بد بلاواں لے کے جا رہا ہے تو کے ٹو؟؟

کسے ہوئے سمارٹ جسم کا نوجوان، اس کی متحرک آنکھیں بتاتی ہیں کہ وہ خطرناک حد تک ذہین نوجوان ہے۔ اس کہ یہ بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں دیکھو تو ایسے لگتا ہے کہ کسی وحشی قبائیلی جنگجو کی آنکھیں ہیں۔ ''شہزاد احمد''، یہ بھی بابر کے کالج میں طالب علم ہیں۔ ہائیکنگ کا تجربہ تو کوئی نہیں لیکن روزانہ کی کئی گھنٹوں سخت ایکسر سائز بیڑہ پار لگانے کے چانس ازحد نمایاں ہیں۔

گول گول آنکھیں گھماتے، آنکھوں سے زیادہ بات کرتے ہوے ہاتھ گھماتے اور ہاتھوں سے زیادہ زبان چلاتے، گول مٹول، ''معصوم شاطر'' چہرہ اگر کہیں نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ''رفیق احمد'' ہے۔ دُبلا پتلا لیکن سخت جسم کا مالک، دومرتبہ چھوٹی موٹی ہی سہی ہائیک کر چکا ہے۔

خالص ملتانی کڑھائی کا شارٹ کرتہ اس کے نیچے تنگ جینز، ملتانی سوہن حلوے کی مٹھاس میں گندھا ایک کھلنڈرا سا نوجوان

اگر کہیں نظر آئے تو سمجھ لیجیے گا وہ ''حمید نظامی'' ہے۔ نوائے وقت اخبار والے حمید نظامی نہیں، کرنل صاحب کے بیٹے کے سالا صاحب ہیں یہ، اور ملتان سے تشریف لائے ہیں۔ ہائیکنگ کا شوق رکھتے ہیں اور یہی ان کا کل تجربہ ہے۔

تعارف کے بعد ٹور پہ ضرورت پڑھنے والی اشیائے ضرور یہ کا تعین ہوا، مختلف احباب کی ڈیوٹیاں لگیں، اور تمام آحباب کو دس اگست سے پہلے پہلے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرکے کرنل صاحب کو رپورٹ کرنے کا حکم ہوا، اور سب احباب کو بلا تفریق اگلے تین ماہ سخت ایکسر سائز کرنے کا سختی کے ساتھ حکم ہوا، اگر ٹور پہ جانا ہے۔

اور حکم ہوا کہ تیرہ اگست کی رات سب کرنل صاحب کے ہاں گزاریں گے، جہاں سے چودہ اگست کی صبح اسلام آباد سے اسکردو بذریعۂ ہوائی جہاز جایا جائے گا۔ اور پھر تین ماہ کی سخت جاں توڑ محنت کے بعد، نو اگست، دوپہر تین بجے اس ٹور کا بانی، روح رواں اور میرا جگری یار اپنے حصے کا سامان کرنل صاحب کے ہاں جمع کروانے جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار لینڈ کروزر نے پیچھے سے آکر بائیک سوار میاں طارق کو اٹھا کر عین سڑک کے درمیان پٹخ دیا، جس سے میاں طارق کی ٹانگ دو جگہ سے فریکچر ہوگئی اور یکبار گی ایسا لگا کہ ہمارے ٹور کو بھی فریکچر کرگئی مگر کرنل صاحب نے اعلان کر دیا کہ ٹور جائے گا اور وقتِ مقررہ پر جائے گا۔ فوجی کی سوئی اٹک گئی تھی۔

تیرہ اگست کو دوپہر دو بجے میں اپنے ذاتی ساز و سامان سمیت کرنل صاحب کی رہائش گاہ پہ پہنچا تو ایک اور روح کھینچنے والی خبر ملی کہ سکردو جانے والی پرواز میں ہماری تین نشستیں جو کہ کنفرم تھیں، تین نشستیں وی آئی پی آمد کی وجہ سے کینسل کر دی گئی ہیں اور اسی وجہ سے ہمارا سامان بھی نہ جا سکا تھا جو ویسے بھی روٹین سے کافی زیادہ تھا۔ لو جی! ایک بار پھر ٹور کا سنگھاسن ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔

ایسے میں پھر عزم و ہمت کے پیکر کرنل صاحب بولے ''میاں طارق تو رہ گئے، باقی کے دو افراد بذریعہ ٹیوٹا سامان لے کر سکردو پہنچیں گے، کون سے دو افراد یہ قربانی دیں گے؟ فوجی کی سوئی ابھی تک اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے اور بابر نے جھٹ سے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ تو صاحبو! ۱۴ اگست کو صبحِ صادق کے وقت، ایک نواں نکور لگژری ٹونس، ایک عدد شریف صورت کوہستانی ڈرائیور سمیت مجھے، بابر اور سامان کو لے کر راولپنڈی کی سڑکوں پہ دوڑنے لگا۔۔۔ رہے نام اللہ کا۔۔۔ اوئے کے ٹو! ہم چل پڑے ہیں، بس آئے کہ آئے کھلوتے تیرے پاس۔

راولپنڈی سے چلے تو صبحِ صادق سے کافی پہلے کا وقت تھا، مال روڈ کی ''بتیوں اور آوارہ کتوں'' کے علاوہ ہر طرف ہو کا عالم تھا، سڑک پہ جلتے بجلی کے قمقموں کی روشنی میں دُکانوں کے تھڑوں

کہتے ہیں کہ بھلے وقتوں میں گائیکی کے زور پر بھی بارش برسائی جاتی تھی اگرچہ آج کے سائنسی دور میں بھی مصنوعی بارشوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے لیکن بات پوری طرح بنی نہیں۔

اب بھی یار لوگ دفتروں سے چھٹی کرنے اور ہاری ہوئی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی میچ بچانے کے لئے اپنی نظریں آسمان پر ہی ٹکاتے ہیں۔

اب نہ تو وہ پہلے سے گلوکار رہے ہیں اور نہ ہی سر سنگیت کے راگ اور راگنیوں سے پانی برستا نظر آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کچھ گلوکار اور راگ دوسروں کی آنکھوں کا پانی بہانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں جبکہ آنکھوں کے پانی کا باقی رہنا بہت ضروری ہے۔

شامتِ اعمال از اظہر سلیم مجوکہ

پہ کہیں کہیں محنت کش چادریں اوڑھے کوک سوئے ہوئے تھے، ایسا ہی کچھ عالم ہماری گاڑی کے اندر تھا، بابر پچھلی نشست پہ منہ کھولے، جسم کو ڈھیلا چھوڑے "گرڑڑ، گرڑڑ، گرڑڑ" خراٹے لئے جا رہا تھا اور کہیں پریوں کے دیس میں تھا۔

کوہستانی ڈرائیور! نان سٹاپ بولے چلا جا رہا تھا، جس کی مجھے کچھ سمجھ آتی تھی اور کچھ نہیں، وہ مجھے تنبیہاً کئی بار کہہ چکا تھا کہ "صیب! ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پہ متی سونا، خی خی خی، پھر میرے کو بھی نیند آتا اے نا، اور اگر امارے کو نیند آتا اے ناں، خی خی خی، تو پھر سمجھو سب کو پاکی (پکی) نیند آتا اے۔۔۔خی خی خی۔

جب وہ ہنستا تو سیٹ پہ اچھل اچھل جاتا اور میری آنکھوں میں اترتی نیند میلوں دور بھاگ جاتی۔

"گل محمد! خیال رکھنا! میں نے نماز فجر ادا کرنی ہے، کسی مناسب جگہ روک دینا!!"

"خی خی خی۔۔۔" وہ پھر سے سیٹ پہ اچھلتے ہوئے بولا "ماڑا تم پیکر نا ئیں کرو، ابھی بہت وقت ہے۔"

میں مطمئن ہو کر ذرا سا ریلیکس ہوتے ہوئے، اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے، پاؤں جہاں تک ممکن ہو سکتے تھے، پسارے، سیٹ کے ساتھ سر رکھ کے آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحہ بعد ہی گل محمد نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا "صیب! خی خی! سونے کا نا ئیں، امارہ چھوٹا چھوٹا بچہ لوگ اے۔"

"گل محمد! تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"سولہ صیب!"

مجھے تو جیسے کرنٹ لگا۔

"ہیں؟ اوے نہیں یار!!" عمر میں مجھ سے بھی کچھ چھوٹا لگ رہا تھا۔

"ہے نا صیب! سولہ بچہ لوگ، دو بیویاں، مائی باپ، چھ بھائی لوگ، تین "پھوج" میں اے، اللہ کا شکر اے صیب سب کچھ ہے نا۔۔۔صیب تمہارا کتنا بچہ لوگ اے؟"

"ابھی تو دو ہیں۔"

اب اچھلنے کی باری اُس کی تھی۔

> جب میز پر سب پلیٹیں صاف ہو گئیں اور دودھ کے گلاس خالی ہو گئے، پروفیسر شاہ سوار خاں نے ایک زبردست ڈکار لی۔ شاید زبردست ترین ڈکار جو اُس الاٹ کے ریسٹوران میں کسی نے نہ لی ہو گی اور جس نے اس کمرے میں بیٹھے ہوئے سب بوڑھاؤں کی نظر پروفیسر کی طرف مرکوز کر دی۔ میں نے ایک بوڑھا عورت کو، جو ایک پھولدار غرارہ پہنے ہوئی تھی، ڈر کر اپنی چائے کی پیالی کو نیچے فرش پر گراتے سنا۔ اس نے غالباً سمجھا تھا کہ کوئی مرکھنا درندہ شیزان میں گھس آیا ہے۔ پروفیسر اُس ہلچل سے، جو اس نے پیدا کر دی تھی، قطعاً بے پرواہ اور غیر متاثر تھا۔
>
> **چاکیواڑہ میں وصال از محمد خالد اختر**

"ہائیں! ماڑا صرف دو؟"

میں تو ایسے شرمندہ ہو گیا جیسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا گیا ہوں۔

اتنی دیر میں ہم ٹیکسلا پہنچ چکے تھے۔

۱۶۰۰ قبل مسیح آریائی نسل کے لوگ وسط ایشیاء سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے، یہیں پر ان لوگوں نے اپنی مشہور تصنیف "رگ وید" لکھی، جس سے پھر دنیا میں اک ایسے معاشرتی نظام نے جنم لیا جس نے "ذات پات" کی بنیاد رکھی، صدیوں تک یہ شہر علوم و فنون اور ثقافت کا مرکز رہا، ۵۳۰ قبل مسیح تک یہ شہر "سائرس اعظم" کی یونان سے لے کر دریائے سندھ تک پھیلی سلطنت کا حصہ رہا، یہی وہ سرزمین ہے جس پر "بدھ مت" مذہب کو بے مثال عروج ملا، پتھروں پہ کندہ مہاتما بدھ کی تعلیمات آج بھی جا بجا لکھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ بدھا کے مجسمے اس شہر کی رونق اور پہچان ہیں۔ چونکہ یہاں کے لوگ ماہر سنگ تراش تھے اسی وجہ سے یہ شہر "ٹیکسلا" کہلایا۔ "ٹیکسلا" سنسکرت زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں "تراشا ہوا پتھر"۔ راولپنڈی سے تیس کلو میٹر پر اس شہر میں ہی سکندرِ اعظم نے مقامی راجہ، راجہ امبھی کی معاونت سے مشہور "راجہ پورس" سے مشہور جنگ کی حکمت عملی طے کی تھی۔

رات کے آخری پہر ہم اسی تاریخی ٹیکسلا شہر کے بیچوں بیچ سے

گزر رہے ہیں، سڑک پہ تاریکیوں کا راج ہے اور ہم ہیں دوستو!
ٹیکسلا اگر تاریخی طور پر جنگی اہمیت کا شہر ہے تو اس کا جڑواں شہر ''واہ کینٹ'' جدید جنگی اہمیت کا شہر کہ پاکستان کی سب سے بڑی اسلحہ ساز فیکٹری اسی ''واہ کینٹ'' میں ہے۔اسی ''واہ کینٹ'' سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ''حسن ابدال'' ہے جہاں ہر سال اپریل کے مہینے میں ''بیساکھی'' کا مشہور و معروف میلہ لگتا ہے، جی ٹی روڈ پہ واقع حسن ابدال سکھ برادری کے مذہبی گرو ''بابا گرو نانک کا پنجا صاحب'' جو کہ سکھوں کے لئے مکہ مدینہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہیں حسن ابدال میں ہی موجود ہے۔اپنی پڑھائی، نظم و ضبط اور عسکری تربیت کے حوالے سے مشہور و معروف درس گاہ ''ملٹری کیڈٹ کالج'' بھی اسی شہر کے ماتھے کا جھومر ہے۔اور ہم اسی حسن ابدال سے اِس وقت گزر رہے ہیں، جہاں مختلف ہوٹل اور دوکانوں کے سائن بورڈ گھپ تاریکی میں جگمگ، جگمگ کر رہے ہیں۔

پیچھے گاڑی میں مڑ کر دیکھا، بابر حسبِ سابق پچھلی نشست پہ خراٹوں کی لمبی گرراری ڈالے گڑ ڑڑ کا میوزک لگائے سو رہا ہے، گل محمد منہ میں تازہ تازہ نسوار رکھے مستی میں آئے سانڈ کی طرح ٹیوٹا بھگائے چلا جا رہا ہے کبھی کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتا ہے کہ سویا تو نہیں۔
میری بیزاری کی سی کیفیت دیکھ کے بولا ''صیب ! نوری جیہاں کو سنے گی؟''
''ہیں؟ نور جہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تو مست بھینسے کے مافق اثبات میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگادی۔
چاندنی راتیں او چاندنی راتیں
سب جگ سوئے، ہم جاگیں، تاروں سے کریں باتیں
چاندنی راتیں او چاندنی راتیں
رات کی تاریکی میں پھیلے سناٹے میں اور پر سکون خاموشی میں، مجھ پر تو جیسے وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں مست، مست ہوتا چلا جا رہا ہوں مگر جونہی یہ مستی نیند کی سرحدوں کو چھونے لگتی، گل محمد ایک زوردار ''اونہہ ہوں'' کہہ کر سارا موشن ہی توڑ دیتا اور میں منہ ہی منہ میں بے اختیار بڑبڑاتا ''تیری پین دی سری!''
اِسی حسن ابدال سے اگر سیدھے جی ٹی روڈ پر مغرب کی طرف سفر جاری رکھیں تو پشاور سے ہوتے ہوئے مشہورِ زمانہ ''درہ خیبر'' کو کراس کر کے افغانستان اور پھر اس سے آگے وسطِ ایشیائی ریاستوں تک جایا جا سکتا ہے اگر حالات موافق ہوں تو۔۔۔
لیکن جی ٹی روڈ کا اور ہمارا ساتھ اِسی حسن ابدال تک ہی تھا، یہاں سے دائیں طرف مڑ کر ہمیں ایبٹ آباد جانا تھا۔
خالی سڑک دیکھ کر مستی میں آیا ہوا گل محمد ''بچہ جمہورہ گھوم جا'' ٹائپ کا اپنی زبان میں کوئی نعرہ لگاتا ہوا دائیں طرف گھوم گیا۔اب ہم ایبٹ آباد کی طرف رواں دواں تھے۔
ہمارا اگلی منزل تھی ''حویلیاں''، اسلحہ ساز فیکٹری کی وجہ سے مشہور شہر حویلیاں کہ جسے ''شاہراہ ریشم'' کا Zero Mile بھی کہتے ہیں.
''حویلیاں'' وہ شہر ہے، جہاں سے شاہراہِ ریشم کا آغاز ہوتا ہے، یہاں سے ایبٹ آباد صرف پندرہ کلومیٹر کی مسافت پہ ہے اور ہم رات کے اِس آخری پہر گھپ اندھیرے میں حویلیاں سے ایبٹ آباد کی طرف دوڑے ہی چلے جا رہے ہیں۔

عنصر شبیر صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر ''گوجرانوالہ'' سے ہے چنانچہ اسی نسبت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ بقلم خود بھی عہد جوانی میں چھوٹے موٹے پہلوان رہ چکے ہیں۔ ایم اے اکنامکس , ایم اے اردو کر چکے ہیں۔ پیدائشی کھلاڑی ہوئے ہیں۔قومی سطح تک فٹبال کھیلے اور کوہ پیمائی کی۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف مقامات کی ہائیک کر چکے ہیں۔۱۹۹۶ء میں ''کے ٹو'' بیس کیمپ پر پہنچے اور وہاں سے ''گوندو گورولا گلیشیر'' سر کیا، تب تک چند ایک پاکستانیوں نے ہی اس درے کو عبور کیا تھا۔مختلف ادبی تنظیموں کے رکن ہیں۔ من موجی قلمکار ہیں، تین عدد سفرنامے لکھ چکے ہیں اور جب جی چاہے چھوٹا موٹا کالم بھی لکھ مارتے ہیں۔

سفر وسیلۂ ظفر

ارمان یوسف

برمنگھم میں شب و روز

لندن ایکسپریس کا بارہواں باب

برمنگھم کو برطانیہ کے دوسرے بڑے شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بڑا شہر کون سا ہے؟ بھول گئے کیا؟ بھئی لندن ہی تو ہے۔ لندن نہ صرف برطانیہ بلکہ یورپ کا سب سے بڑا اور گنجان آباد شہر ہے۔ برمنگھم کی آبادی لگ بھگ ۱۱ لاکھ نفوس پہ مشتمل ہے۔ ۲۶ فیصد ایشیائی تارکین آباد ہیں جن میں سے ۱۳ فیصد خالص پاکستانی ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی اور صنعتی پیداوار کے لحاظ سے ۱۹۷۱ء میں یہ شہر دنیا کا سب سے بڑا مرکز تھا، جسے صنعتی دنیا کا دارالخلافہ بھی کہا جاتا رہا۔ برمنگھم سٹی کونسل یورپ کی سب سے بڑی ''لوکل اتھارٹی'' ہے۔ جسے ۴۰ وارڈز میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کا مرکزی دفتر وکٹوریہ سکوائر میں واقع ہے۔ اس علم دوست اور علم پرور شہر میں پانچ بین الاقوامی معیار کی یونیورسٹیاں، ۴۱ مقامی لائبریریاں اور ایک موبائل لائبریری بھی ہے۔

مزے کی بات یہ کہ یہ لائبریریاں ہمارے ہاں کی لائبریری جیسی غیر آباد نہیں بلکہ برمنگھم لائبریری، جو یورپ کی سب سے بڑی لائبریری بھی ہے، میں سالانہ چالیس لوگ آتے ہیں، سچ ہے کہ لائبریریاں آباد ہوں تو قومیں بھی آباد رہتی ہیں۔

برمنگھم شہر میں ۵۷۱ پارک ہیں جو یورپ بھر میں کسی بھی شہر

میں سب سے زیادہ ہیں۔ پارکوں اور باغوں والے اس خوبصورت شہر میں پھولوں جیسی شخصیت والے عباس ملک سے ہماری دوستی کب، کیسے اور کیوں ہوئی یہ بھی ایک طویل داستان ہے۔

صدیوں کا یہ قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

بزرگ فرماتے ہیں کہ جب خدائے وحدہ لاشریک نے میدانِ عرفات میں قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کی روح کو اکٹھا کیا اور سوال کیا ''کیا میں تمھارا رب نہیں؟'' تو تمام ارواح نے اس وقت یک زبان ہو کر اقرار کیا کہ یقیناً آپ ہی ہمارے رب ہیں تو اس محفل میں عباس ملک اور ہماری روح بھی موجود تھی۔ ہوا یوں کہ اسی اقرار بندگی کو ملک صاحب ''ترنم'' کے ساتھ قبول کر رہے تھے اور اس ''ترنم'' کی داد دینے والی قرب و جوار میں واحد ہماری روح تھی۔ یوں روحوں نے اسی روز دوستی کر لی اور ہم آملے آج برمنگھم میں۔

''اب کیا ارادہ ہے'' ملک صاحب نے کہا۔

''بھئی یوں تو ہماری باگ ڈور آپ ہی کے ہاتھ میں ہے مگر ہم چاہیں گے کہ سب سے پہلے یورپ کی سب سے بڑی لائبریری یعنی برمنگھم لائبریری کی زیارت کریں۔''

ملک صاحب نے گاڑی کا رخ ایک طرف موڑ دیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم کتابوں کے ایک خوبصورت اور انمول ذخیرے میں موجود تھے۔ لائبریری کی عمارت زیب و زینت کے اعتبار سے بھی منفرد اور خوبصورت ہے۔ ساری عمارت شیشے سے ڈھکی ہے۔ آپ لائبریری کی بلند و بالا عمارت سے شہر بھر کا بخوبی نظارہ کر سکتے ہیں۔ مختلف موضوعات کے لحاظ سے کتابوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں میں بھی کتب موجود ہیں۔ اردو میں بھی کتابیں دیکھنے کو ملیں۔ عباس ملک کے بقول یہاں ہر لائبریری میں اردو زبان میں کتابیں موجود ہیں۔ لائبریری کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک جانے کے لیے خودکار سیڑھیاں لگی ہیں۔ چائے، کافی کا بھی ایک کونے میں اہتمام کیا گیا ہے۔ پتہ چلا کہ برطانیہ بھر میں لائبریریوں کی رکنیت مفت میسر ہے۔ آپ ۲۰ کتابیں ۲۱ دن کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آڈیو کتابیں، فلمیں اور دیگر موضوعات پر ویڈیو سی ڈیز سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مگر ہمیں تو برمنگھم سے لطف اندوز ہونا تھا۔ لہٰذا ٹاؤن سنٹر کو چل دیے۔ مرکزی شاپنگ سنٹر بل رنگ کی پارکنگ میں کار پارک کی اور سیڑھیاں چڑھتے اوپر آئے۔ یہاں دنیا بھر کے مشہور برانڈ دیکھنے کو ملے۔ یہ مقام شروع ہی سے برمنگھم کا کاروباری مرکز رہا ہے مگر قانونی کاغذوں

میں اس کا ریکارڈ ۱۱۵۴ء میں ملتا ہے جب شاہ وقت ہنری دوم کی طرف سے تاجروں کو کاروباری حقوق دیئے گئے تھے۔ بعد کے ادوار میں بھی قابلِ ذکر ترقی ہوتی رہی۔ ۱۹۶۰ء میں پورا بلڈنگ قریب قریب نئے سرے سے تعمیر ہوا۔ بعدازاں ۲۰۰۳ء میں بھی مارکیٹ میں اضافہ ہوا۔ اب تو ہر طرف آسمان کی بلندیوں کو چھوتی طرح طرح کی جدید عمارتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ فٹ بال بلڈنگ برمنگھم شہر کی نشانی بن چکی ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سفر کے لیے ریلوے سٹیشن اور بس سٹیشن بھی موجود ہیں جبکہ مقامی علاقوں میں آنے جانے کے لیے چار پاؤنڈ کا ٹکٹ لے کر آس پاس کے قصبوں وال سال، ویڈز بری، وولورہمپٹن وغیرہ میں سے کہیں بھی جتنی بار چاہیں ایک ہی ٹکٹ پر سفر کر سکتے ہیں۔

ہم نے ایک طرف سے مارکیٹ میں داخل ہو کر اور دوسری طرف سے سکندر کے دنیا میں خالی ہاتھ آنے اور جانے والے سبق آموز واقعے کو زندہ کر دیا۔ دیکھنے کو یوں تو بہت کچھ تھا، پہننے سے لے کر اوڑھنے تک کی تمام برانڈ کی مصنوعات الیکٹرانکس اور یہاں تک کہ ایک دکان میں روبوٹ بھی دیکھے۔ مگر ہماری نظر تو مصنوعات سے زیادہ خریداری کرنے والیوں پر تھی۔ خدا رکھے۔ کیا دلکش چہرے نظروں سے گزرتے رہے۔ زیادہ تر جوڑوں کی صورت میں۔ ہر رنگ اور نسل کے لوگ دیکھنے کو ملے۔ ہائی سٹریٹ میں لوگوں کا جمِ غفیر دیکھا تو ہم بھی لپکے۔ پتہ چلا کہ کوئی تماشا کرنے والا موسیقی کی تال پہ اپنے کرتب دکھا کے لوگوں کو لطف اندوز کر رہا تھا۔ عباس ملک کے بقول یہاں اکثر منچلے شغل میلا کرتے رہتے ہیں۔ کوئی موسیقی الاپتا رہتا ہے تو کوئی اپنے اپنے فن کی مہارت اور جادو جگاتا ہوا یہاں ملتا ہے۔ ایک طرف لاؤڈ سپیکر پہ عیسائیت کے پیروکار اپنے مذہب کی دعوتِ عام کر رہے ہوتے ہیں اور کچھ ہی فاصلے پر مسلمان بھی اپنا ٹھیلا لگا کر قرآن کی تلاوت اور اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہے ہوتے ہیں۔

اتنے میں بھوک بھی اپنے ہونے کا احساس دلانے لگی، شاید عباس ملک کی بھی یہی کیفیت تھی۔ کہنے لگے ''کھانا انگریزی کھائیں گے یا دیسی۔''

''انگریزی تو بس ہمیں میم ہی اچھی لگتی ہے، کھانا مگر دیسی ہی اور یہ بھی کہ ہم جب تک پیٹ بھر کے کھانا کھا کر با آوازِ بلند دو چار ڈکار نہ مار لیں ادائیگی شکر خود پر واجب ہی نہیں سمجھتے۔''

عباس ملک نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور برمنگھم کے علاقے سپارک بروک کو چل دیے۔ یہاں لیڈی پول روڈ، سٹرڈ فورڈ روڈ اور کوونٹری روڈ پر ''لاہور کڑاہی''، ''دیسی کھانا''، ''کراچی بریانی'' اور ''لاہور ویلج'' جیسے ناموں کے کئی مزیدار دیسی کھانوں والے ریسٹورنٹ موجود ہیں۔ ایک جگہ تو ساگ اور باجرے کی روٹی بھی مل رہی تھی۔ ہوٹلوں کے علاوہ ان علاقوں میں پاکستانی مصنوعات کے بڑے بڑے سٹور بھی موجود ہیں جہاں کا عملہ اور خریدار دونوں ہی زیادہ تر پاکستانی ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر شلوار قمیص میں ملبوس دیسی لڑکیاں، عورتیں اور مرد وطن کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ برمنگھم کے علاقے آلم راک کا تو یہ عالم ہے کہ لاہور کی انارکلی کا گمان ہوتا ہے۔

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ان دنوں ڈاکٹر خالد جاوید جان بھی نیویارک سے لاہور جاتے ہوئے لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اگلے روز ادبی تنظیم ''فانوس'' کے زیرِ اہتمام اُن کے اعزاز میں مشاعرہ رکھا گیا تھا، جو بہت شاندار رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے گرجدار آواز میں اپنی نظم ''میں باغی ہوں'' سنا کر محفل ہی لوٹ لی۔

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز و مزاح اِن کا سلوبِ بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفر نامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جو کھائیں عاشقی میں جُوتیاں تسلّی سے
سُنائیں گے وہ کبھی داستاں تسلّی سے

وصال و قُرب کی خواہش میں ہم تڑپتے رہے
رقیب بیٹھ گیا درمیاں تسلّی سے

جدید دور میں کرتے ہیں یوں خودی کو بلند
بناتے رہتے ہیں وہ "سیلفیاں" تسلّی سے

ہمارے عہد کی پوشاک بھی نرالی ہے
نہاں جو ہونا تھا وہ ہے عیاں تسلّی سے

ہمیں تو بوٹیاں کیا چھیچھڑے بھی مل نہ سکے
رقیب نے ہمیں دیں ہڈیاں تسلّی سے

چغد بناتے ہیں پہلے عوام کو لیڈر
ہر ایک لیتا ہے پھر باریاں تسلّی سے

نمازی رہ گئے پڑھتے نماز مسجد میں
چُرا کے لے گئے وہ جوتیاں تسلّی سے

نہ دیکھا کوئی بھی ذی روح آدمی کے سوا
جلائے اپنا جو خود آشیاں تسلّی سے

مقاصد ارفع و اعلیٰ ہیں سن گلاسز کے
وہ ان سے تاڑتے ہیں لڑکیاں تسلّی سے

غریب اور زیادہ غریب ہوتا ہے
بناتے ہیں وہ دُکاں پر دُکاں تسلّی سے

جو چاہتے ہو کہ امن و امان ہو مظہرؔ
تو گھر میں بیوی ہو باہر میاں تسلّی سے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سُر سے جب سُر کو وہ ملاتے ہیں
لوگ محفل سے بھاگ جاتے ہیں

پیٹھ اپنی اگر کھجاتے ہیں
بھیڑ میں اُن سے مار کھاتے ہیں

سادگی دیکھیے ذرا ان کی
قرض لیتے ہیں، بھول جاتے ہیں

بے وقوفی نہیں تو کیا کہیے
آزماؤں کو آزماتے ہیں

بیٹھ کر سر بلند لوگوں میں
اب تو بونے بھی قد بڑھاتے ہیں

اہلِ دانش سمجھتے ہیں خود کو
بات بے بات سر ہلاتے ہیں

یوں خودی کو بلند کرتے ہیں
رات دن سیلفیاں بناتے ہیں

شعر چوری شدہ ہمارے پڑھیں
حیف مصرعے بھی ہم اٹھاتے ہیں

ہم ظرافت کو اوڑھ کر مظہرؔ
غم ہنسی میں اڑاتے جاتے ہیں

تنویر پھولؔ

آنکھ کا پانی جو مرتا ہی نہیں
جوش کا دریا بپھرتا ہی نہیں

بکرے کی ماں نے اُسے کیا کہہ دیا!
تیرا بکرا گھاس چرتا ہی نہیں

شیر، گیدڑ بن گیا جنگل میں ہے
اب تو کوئی اس سے ڈرتا ہی نہیں

قوم کے ہر فرد کی خالی ہے جیب
لیڈروں کا پیٹ بھرتا ہی نہیں

جو زباں کھولے، اُسے وہ مار دیں
اب کوئی الزام دھرتا ہی نہیں

فوج کتوں کی، گلی میں ہے تری
تیرا عاشق واں گزرتا ہی نہیں

پیر جی بیٹے سے یوں ناراض ہیں
''کارنامہ'' کوئی کرتا ہی نہیں

گلبدن کی ڈانٹ کا ہے یہ اثر
اُس کا شوہر اب سنورتا ہی نہیں

پھولؔ! تیرے یار کے سر پہ ہے بھوت
لات کھائے بن اُترتا ہی نہیں

تنویر پھولؔ

سامنے اب تیرا مکھڑا چاہیے
ٹاٹ کا ہٹنا یہ پردہ چاہیے

کھا چکے ہیں بوٹیاں وہ کئی کلو
مولوی صاحب کو حلوہ چاہیے

حضرتِ غالبؔ نے خود سے ہی کہا
''آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے''

ماسٹر جی کو ملی روزانہ دال
ان کا چہرہ تو اترنا چاہیے

روز وہ مرغا بنائیں اس لئے
ڈائننگ ٹیبل پہ مرغا چاہیے

ان کا بیٹا یوں تو ہے کالا توا
رُخ دُلھن کا گول چندا چاہیے

مرغیاں کرتے ہیں چوری بار بار
ان کو اپنے گھر میں ڈربا چاہیے

روز مسجد جا رہے ہیں شیخ جی
پھر نئے جوتوں کا جوڑا چاہیے

پھولؔ! وہ کھاتا ہے انڈے شوق سے
اُس کو ہر پیپر میں انڈا چاہیے

ڈاکٹر عزیز فیصل

ہم ترے چوتھے ولیمے میں نہیں آئیں گے
اس ترے عائلی جھگڑے میں نہیں آئیں گے

دیکھ کر تیرا رقیبوں سے ملن چوری چھپے
نارمل لوگ ہیں، غصے میں نہیں آئیں گے

ہجر لیلیٰ کی اذیت سے گزرتے ہوئے قیس
اتنے فربہ ہیں کہ رکشے میں نہیں آئیں گے

پان ونسوار کے ہوتے ہوئے نازک کیڑے
ترے دانتوں کے محلے میں نہیں آئیں گے

متوفی میں کئی خوبیاں ہوں گی لیکن
اتنے القاب تو کتبے میں نہیں آئیں گے

یہ جو حضرت سے ہیں دل پھینک نما سادہ لوگ
اے محبت ترے چکمے میں نہیں آئیں گے

تو اناڑی ہے، سیہ بخت بھی، کنجوس بھی ہے
چاند چہرے ترے نرغے میں نہیں آئیں گے

دفتر عشق کے افسر نے کہا مجنوں سے
آپ اب ڈیوٹی پہ کچھے میں نہیں آئیں گے

لفٹ دوں گا نہ سکوٹر پہ کسی مہ وش کو
اب دوپٹے کبھی پہیے میں نہیں آئیں گے

پونیاں دوں گا بشیراں کو میں تب تحفے میں
بال جب اس کے پراندے میں نہیں آئیں گے

ڈاکٹر عزیز فیصل

پیش جاناں کو سیلری کی تھی
تیس دن شکل ماتمی کی تھی

جس زمیں میں وہ شعر کہتی گئی
وہ زمیں خوب گوبری کی تھی

سچ تو یہ ہے میاں کولمبس نے
جا کے یو ایس میں لوفری کی تھی

یخ دسمبر میں ململی کِٹ نے
سب کی آنکھوں میں کھلبلی کی تھی

عشق میں کاہلی دکھانے پر
میں نے رانجھے کی "بیستی" کی تھی

ڈٹ کے کرتا رہا زمانہ عشق
میں نے بھی کون سی کمی کی تھی

عقد ثانی کا چانس مس کر کے
بزدلی سی بہادری کی تھی

آج میک اپ تھا دو کلو سے بھی کم
اس نے کیوں حسن میں کمی کی تھی

نارمل سی مری محبت تھی
اور بشیراں سے اونلی کی تھی

وہ جو چڑتی تھی سرخ رنگت سے
پیش اس کو سٹابری کی تھی

چاند پر بھی "کریم" جائے گی
پیش گوئی یہ جوتشی کی تھی

ہیر کو چاہیے تھا ایل سی ڈی
اس نے نیلام بانسری کی تھی

کود کر قافیے کے دریا میں
میں نے فیصل غزل کشی کی تھی

عرفان قادر

سٹاک کر کے رکھا کس لئے بھلا دل کا؟

مجھے یہ شک ہے کریں گے وہ ناشتہ دل کا!

پلاسٹک کا بنے گا، چلے گا ایک ہی دن

کرے گا حال بُرا ایسا، چائنا، دل کا!

گٹار کیوں نہ خریدا تھا بانسری کی جگہ؟

سبب یہی ہے کہ رانجھا نہ تھا کھُلا دل کا!

کنال بھر پہ تو پھیلا ہوا ہے جسم مگر

نہیں ہے بال برابر ہی ایریا دِل کا!

جو اِس کی بات نہ مانے، ہے آبرو اُس کی

گلی میں مار کھلاتا ہے لوتھڑا دل کا!

نیا ہو یا ہو پرانا، نہیں حرج کوئی

مجھے قبول ہے، میں ہوں کباڑیا دل کا!

عدالتوں میں کرپشن کے کیس جب آئے

بڑے بڑوں کو ہوا یونہی مسئلہ دل کا!

''خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد''

کوئی بھی کام نہیں ٹھیک، بے حیا دل کا!

رقیب مُنہ کا بھی کالا ہے اپنے دل کی طرح

مگر صنم بھی تو نکلا ہے سانولا دل کا!

کہا ہے خوب کسی عقل مند بابے نے

کہ ہو کے پیٹ سے جاتا ہے راستہ دل کا!

عدو کے ساتھ کھنچائی ہیں سلفیاں اپنی

بنا کہ رکھ دیا ظالم نے کوئلا دل کا!

چکن بھی سیخ میں ایسے نہیں پروتے ہیں

بڑی ادا سے تمھارا وہ ٹانکنا دل کا!

کہیں پہ جاگ نہ جائے چڑیل سوئی ہوئی

نہ اتنے زور سے دروازہ کھٹکھٹا دل کا!

ہے چیز خاص یقیناً یہ، شاعروں کے لیے

مشاعروں میں جو چرچا ہے جا بہ جا دل کا!

یہ دل ہے دل کہ ہے دلدار کو دیا جاتا

جگر کرے گا کہاں سے مقابلہ دل کا!

کہا بھی تھا کہ اسے کنٹرول کر، ورنہ

نیا ہی چاند چڑھائے گا رتجگا دل کا!

سمجھ رہا تھا یہ رانجھا، ہے بھینس کی تصویر

کچھ ایسا ہیر نے خاکہ کیا ''ڈرا'' دل کا!

ہے ایک اور مکیں کی بھی اس میں گنجائش

لیا جو خوب تسلی سے جائزہ دل کا!

ہم اُس کو نہر کے پُل پر بہت بلاتے رہے

بہانہ کر کے نہ آیا فراڈیا دل کا!

پلاؤ شربتِ دیدار، ساتھ صندل کے

نہ جانے ٹھیک ہو کس شے سے عارضہ دل کا!

کسی رقیب سے چپ چاپ ڈیل کر بیٹھے

اگر دماغ نہ ہو، کیا ہے فائدہ دل کا؟

مزاح کھاد کی صورت ہے زندگانی میں

اسی کے دم سے ہے پودا ہرا بھرا دل کا!

عرفان قادر

پاپ میوزک کا ہے کانوں میں ''ترنم'' اب تک
کھول اُٹھا خون تھا، جاری ہے تلاطم اب تک

ڈاکٹر بن گئی لیلیٰ تو کئی برسوں سے
پاس مجنوں نہیں کر پایا چہارم اب تک

ہو سیاست میں، مگر مال بٹورا بھی نہیں
مارتے جھک ہی رہے یونہی میاں، تم اب تک

ممناتی ہوئی بکری کی طرح ہوتا تھا
یاد ہے یار کا اندازِ تکلم اب تک

ہم اُنھیں بانگِ درا گفٹ میں دے آئے ہیں
جو پڑھا کرتے رہے صوفی تبسم اب تک

کوئی مشکل نہیں، آسان سا رکھتے ہیں حساب
پانچ سالوں میں ہوا طفل ہے پنجم اب تک

ریشمی زُلف کا احساس خیالوں میں لیے
تھامتا ہاتھ میں تھا بھینس کی وہ دُم اب تک

پیڑ سے آم نہیں توڑ سکا وہ ہیرو
توڑ کر لانے تھے جس نے مہ و انجم اب تک

ساس لاہور میں تھی اور کراچی تھی بہو
اِس لئے ہو نہ سکا اُن میں تصادم اب تک

چل دیا گھر کو، وہ دیوان سُنا کر اپنا
اور محفل میں سبھی لوگ ہیں گم صم اب تک

دلشاد نسیم

کس کڑھی میں ہے یہ ابال آیا
آپ آئے تو یہ خیال آیا

ایک مرغی میں کیا بنے بھیا
ساتھ میرے مرا عیال آیا

خوبصورت تھے تم کبھی پہلے
تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا

ایک بھی پائی نہ نکل پائی
جیب کو بھی وہ کھنگال آیا

اس قدر ہو گیا ہے فیٹی اف
چھوٹے کمرے میں وہ محال آیا

سوچتی ہوں کیا کہوں اس کو
سرمہ آنکھوں سے جو نکال آیا

وہ گرا آخری ہی منزل سے
ہائے ہائے یہ کیا زوال آیا

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

اُس کی بیوی بڑی ہی ٹینشن ہے
عمر جس کی اگرچہ بچپن ہے

سر پہ بیلن پڑا ہے جب سے اُسے
ہر طبق دیکھتا وہ روشن ہے

پیار ملتا نہیں ہے شوہر کو
وار دیتا جو اپنا تن من ہے

مار میں گالیاں بھی شامل ہیں
جیسے روٹی کے ساتھ سالن ہے

مارتی ہے وُہ صرف ڈنڈے سے
لگتی شجرے سے کوئی دھوبن ہے

ساتھ بیگم کے جب ملے بچے
تب سے گردن مری عموداً ہے

اُس کے میک اپ سے لگ رہا ہے یہی
پھر وُہ آئی کرا کے روغن ہے

سارے لوٹے قریب آ جائیں
پھر سے ہونے لگا الیکشن ہے

اب سیاست کا ہر اک لوٹا
لگتا تھالی کا ایک بینگن ہے

سب سیاسی چلیں ہیں ''ہڈی'' پر
اس لیے اوج پر کرپشن ہے

کر دیا ہے مجھے ہلاک اُس نے
میرا پھر سے کٹا کنکشن ہے

روغنی نان سے مچی ہلچل
پیٹ میرے میں ہوتی چھن چھن ہے

اب تو انڈہ بھی اک نہیں دیتی
میری مرغی نے لے لی پینشن ہے

پھول دیتے چبھو گئی کانٹا
اس طرح کی عجیب مالن ہے

کہیں ''موٹو'' کو مُجھ سے پیار نہ ہو
روز کرتی مجھے وہ مینشن ہے

جس کو پائیں تو قے کا خدشہ رہے
وُہ پڑوسن کا پیارا درشن ہے

مرد عورت نُما نظر آئیں
چل پڑا آج کیسا فیشن ہے

جیب کترا وُہ لے اُڑا بٹوہ
جس کی شاید بس ایک ویگن ہے

کچھ تغزل ملے تو دینا داد
ورنہ شعروں پہ لگتی قدغن ہے

کیا کہوں میں غزل پہ اپنی خلیل!
''بونگیوں'' کا حسین مدفن ہے!

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

اس شرارت نے ہم کو سمجھایا
ڈارون تھا ترا ہی اک تایا

عقدِ ثانی تُمھیں بھی راس نہیں
"تُم کو دیکھا تو یہ خیال آیا"

دوست بے ہوش ہو گیا یک دم
جونہی گھونگٹ تھا اس نے سرکایا

تیرا چاچا وُہی تو لنگڑا نہیں؟
جس نے کیدو کا رول دُہرایا

آج اپنی وہ ڈیٹ سے پہلے
دو رقیبوں کی جیب کاٹ آیا

کافی مجنوں بنے ہیں لیلائیں
فیس بُک نے ہم کو بتلایا

بعد شادی کے زندگی میں خلیلؔ
مَیں بھی رویا کبھی ہوں مُسکایا

نویدؔ صدیقی

عمل کے سلسلے جب لفظیاتی ہوتے جاتے ہیں
مسائل عام سے بھی کائناتی ہوتے جاتے ہیں

چھپا کر وہ مکمل آمدن رکھتے ہیں بیوی سے
کہ اب شوہر وزیرِ مالیاتی ہوتے جاتے ہیں

جنھوں نے عمر ساری ایک بھی تنکا نہیں توڑا
وہ اپنے کالموں میں سومناتی ہوتے جاتے ہیں

عجب تاثیر ہے کرسی میں کہ اس سے اترتے ہی
بلند پرواز افسر ارضیاتی ہوتے جاتے ہیں

بدلتی جا رہی ہے برق رفتاری سے یہ دنیا
لبِ شیریں بھی اس کے نمکیاتی ہوتے جاتے ہیں

جو رشوت دے نہیں سکتے نویدؔ ان کے لیے اکثر
پراسس اور لمبے محکماتی ہوتے جاتے ہیں

سالک جونپوری

جب پیپر بکواس ہوا
تب اس کو احساس ہوا

اتنے طعنے ملتے ہیں
جینا ستیاناس ہوا

بگڑ کر حالت ایسی ہے
جھگڑالو سی ساس ہوا

میٹھا اچھا لگتا ہے
دل جیسے مدراس ہوا

بدل گئی رنگت اس کی
چہرہ ہی عکاس ہوا

جہاں کہیں نفرت دیکھی
وہ خطہ حساس ہوا

درد تو آخر درد رہے
الٹا پڑھنا راس ہوا

سالک جونپوری

چمکتی چیز چمکیلی نہ ہو گی
ہماری جیب پھر ڈھیلی نہ ہو گی

میں جیسا تھا میں ویسا ہی رہوں گا
مزاجِ من میں تبدیلی نہ ہوگی

سنی جانِ غزل سے میں نے آخر
نصیحت کیسے کوئی لی نہ ہو گی؟

میں پہلے ہی سے صاحب دل جلا ہوں
تو پھر برداشت اک تیلی نہ ہوگی

سکھانے آگئے محفل میں گر تم
یوں حسرت کوئی تکمیلی نہ ہوگی

جو دل پر میں جو لینا چھوڑ دوں گر؟
بھڑکتی آگ بھڑکیلی نہ ہوگی

تعارف سرسری دیتا ہوں سالک
مگر پہچان تفصیلی نہ ہوگی

م۔ش۔عاؔلم

ہوتی ہیں تیرے بارے میں گرچہ میگوئیاں
تیرے لیے ہیں دادِ ہنر چہ میگوئیاں

ان میں بھی کوئی خیر کا پہلو تلاش کر
ہوتی ہیں گرچہ باعثِ شر چہ میگوئیاں

اِن کے سبب سے راستہ کھوٹا نہ ہو ترا
تو یوں سمجھ، ہیں گردِ سفر چہ میگوئیاں

کل شب سب اہلِ بزم یوں مصروفِ کار تھے
کرتا تھا واں ہر ایک نفر چہ میگوئیاں

''دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی''
غیبت تھی اِس طرف، تھیں اُدھر چہ میگوئیاں

یہ عادتِ بد جن کے ہو شامل سرشت میں
اُن کے لیے ہیں ''قند وشکر'' چہ میگوئیاں

ہیں پست اِن کے ذہن بھی آواز کی طرح
کرتے ہیں جو بھی شام وسحر چہ میگوئیاں

کتنے تعلقات کے خرمن جلا دیے
ہوتی ہیں مثلِ برق و شرر چہ میگوئیاں

عاؔلم کہاں کی بات کہاں تک پہنچ گئی
ہوتی ہیں کتنی زود اثر چہ میگوئیاں

م۔ش۔عاؔلم

گیسوئے اُردو نئے ڈھب سے سنواریں گے تجھے
یعنی ہر رنگ میں انگلش سے بگھاریں گے تجھے

پیریڈ آئے گا دورانِ جماعت جب بھی
پوچھ مت کیسی اذیت سے گزاریں گے تجھے

گو عمل سے تو کریں گے خزاں آلود مگر
اپنی گفتار سے ہر لحظہ ''بہاریں'' گے تجھے

ٹیکسٹ رومن میں دھڑلے سے کریں گے ہم لوگ
اس فرنگن کی بنا پر ہی اُساریں گے تجھے

سخت جانی سے رہے گی، جو رہی تو زندہ
ورنہ اپنے تئیں بے شائبہ ماریں گے تجھے

وہ لب و لہجہ کہ جو ہندی ڈراموں کی ہے دین
اس کے غازے سے ابھی اور نکھاریں گے تجھے

تُو ہے سونا تو بنانے کو تجھے ہم کندن
طرزِ افرنگ کی بھٹی سے گزاریں گے تجھے

ایک عالم میں تری دھوم ہے، تسلیم، مگر
وطنِ پاک میں ہرگز نہ سہاریں گے تجھے

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

تمامی خرچ، کھنگالے کھڑے ہیں
ہمیں خود جان کے لالے پڑے ہیں

اٹھائے گا ضروری ہے صعوبت
کہ ہم چھوٹوں کے جب "لالے" بڑے ہیں

تمہاری واہ سے پھوٹی ہیں خوشیاں
ہماری آہ سے نالے جھڑے ہیں

یہ ہٹ دھرمی اسے مہنگی پڑے گی
اڑنگا اب تلک ڈالے اڑے ہیں

ہماری گنج سے معلوم کر لو
بدن لاغر ہے دو بالے جڑے ہیں

نہ جاؤ دشتِ ہجراں پُر خطر ہے
مسلسل یاد کے کالے گھڑے ہیں

گہرؔ جی لوفروں کے کیا ہی کہنے
ہر اک جا روز سنبھالے تڑے ہیں

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

اگرچہ بولتا رہتا ہے انگ۔۔۔لش فر فر
ہمارے سامنے کرتا نہیں مگر ٹر ٹر

مزا چکا دیا، غصہ کیا، تبھی چھوڑا
دبا کے خوب گلہ جب نکل گئی خر خر

کہاں پہ سنگ کے جذبات ہیں جناب من
کہا جو آپ نے محبوب مرگئے، "مر مر"

سڑک پہ فیس بکی ہڑبڑا کے چیخ اٹھا
سنی قریب سے پہیوں کی تیز تر چر چر

کسی کو فکر نہیں آئی فون کا موذی
مرض جو پھیل گیا ہر گلی پہ یا گھر گھر

گہرؔ اگرچہ ہے شاعر، ادیب ایویں سا
کسی زبان سے سنتا تو ہے کبھی "سر، سر"

جہانگیر نایاب

لوگ کہتے ہیں یہی دیکھنے میں کالا ہوں
میری رنگت پہ نہ جا دل کا بہت اچھا ہوں

مار ہی دیتی مجھے تیری یہ فرقت لیکن
کب سہیلی نے تری چھوڑا کہ میں تنہا ہوں

زندگی نام تنفس کا نہیں ہے بیگم!
اپنی چھمّو کے لیے آج بھی میں زندہ ہوں

ہے بجا تیری جدائی میں تو مر جانا تھا
اب مگر تیری سہیلی سے میں وابستہ ہوں

مرنے جینے کا سبب خوب ہے معلوم مجھے
سرد مہری ہے تمہاری جو میں اک لاشہ ہوں

بے رخی کا ہے وہ اک سنگ، فقط سنگ ہے وہ
اور میں اس کے لئے لوہا، فقط لوہا ہوں

وہ کہ ہے میرے لیے آتشِ دل اے نایاب
میں مگر اُس کیلئے برف سے بھی ٹھنڈا ہوں

ڈاکٹر فریاد آذر

یہ ہے عشق دورِ جدید کا، یہ معاشقہ کوئی اور ہے
میں زکام ہوں کسی اور کا، مجھے چھینکتا کوئی اور ہے

مری زندگی بھی عجیب ہے، مرا کتنا گھٹیا نصیب ہے
میں سہاگ ہوں کسی اور کا، مجھے پیٹتا کوئی اور ہے

کوئی شاعروں کو بلائے کیوں، کوئی اچھا شعر سنائے کیوں؟
ہے یہاں گویّوں کا جم گھٹا، یہ مشاعرہ کوئی اور ہے

کوئی سوکھتا ہے چھوارے سا، کوئی پھولتا ہے غبارے سا
میں کما کے لاتا ہوں دم بہ دم پہ ڈکارتا کوئی اور ہے

جو زمین ہم نے خرید لی، کہیں جا کے تب یہ خبر ہوئی
وہ زمین تھی کسی اور کی، اسے بیچتا کوئی اور ہے

مجھے کس نے الو بنا دیا، مرے سر پہ سہرا سجا دیا
میں نے ان کا گھونگٹ اٹھا دیا تو پتہ چلا کوئی اور ہے

یہ سیاستوں کے معاملے، انھیں ہم کبھی نہ سمجھ سکے
یہاں بھونکتا کوئی اور ہے، ہمیں کاٹتا کوئی اور ہے

جو میں اک مشاعرے میں گیا، مجھے سن کے سب نے یہی کہا
جہاں بلبلیں ہوں غزل سرا وہیں رینکتا کوئی اور ہے

جو ہوا کہیں کوئی حادثہ، مجھے سیدھا آ کے دھرا گیا
کئی سال بعد پتہ چلا پسِ حادثہ کوئی اور ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

ایسا کہیں ویسا کہیں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں
اپنی کہیں اپنی سنیں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

دولہے میاں کی سالیو! پھوٹے مقدر والیو!!
اِک دوسرے کے ''کن'' بھریں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

گو زن مریدی ہے مگر جب زندگی کا ساتھ ہے
مل کر لڑیں مل کر مریں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

ہم جولیو ! آؤ ذرا اِک دوسرے کی بات ہو
کچھ رنگ جیون میں بھریں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

شرفاء کے چمچے سوچ لیں ! نوحے پڑھیں یا مرثیے
لیڈر کو جب رخصت کریں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

ٹینا بھی ہے، مینا بھی ہے، بلو بھی ہے، پنکی بھی ہے
کس پر مریں کس سے ڈریں کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

مستفعلن مستفعلن مستفعلن کرتے ہوئے
آ شاعری مل کر کریں، کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

کچھ شوہروں کے شکوے ہوں، کچھ ساس نندوں کے گلے
یوں ہم سخن بیناؔ رہیں، کچھ تم کہو کچھ ہم کہیں

روبینہ شاہین بیناؔ

بجلیاں مفت میں گراتے ہیں
لوڈ شیڈنگ میں مسکراتے ہیں

یوں بھی چہرے کو وہ چھپاتے ہیں
کر کے میک اپ جو آتے جاتے ہیں

وقت بے وقت آ سلاتے ہیں
خواب تیرے مجھے ستاتے ہیں

ایسی صورت کو کیا کریں جس کو
دیکھ کر لوگ بھاگ جاتے ہیں

ایسے نوکر بھی ہیں جو دفتر میں
مال رشوت کا خوب کھاتے ہیں

یاد آتی ہے جب تری صورت
آپ ہی آپ مسکراتے ہیں

کام کرتے نہیں عوامی کوئی
بس یونہی ایڈ دیتے جاتے ہیں

گھر میں رہتے ہیں دَب کے بیگم سے
رعب دفتر میں آ جماتے ہیں

کھانے پینے کی بات کیا بیناؔ
چائے پر بھی غزل سناتے ہیں

نوید ظفر کیانی

بنا دے بھیجے کی لسی، زنانی ہو تو ایسی ہو
ہماری کھوپڑی مثلِ مدھانی ہو تو ایسی ہو

دکھا کر ایک میزائل کہا ہے ہم نے زوجہ سے
زباں جیسی اگر تم میں روانی ہو تو ایسی ہو

بروئے حسن بے سہرہ، قبولا جائے سہ بارہ
بدن پر ہر چھڑے کے شیروانی ہو تو ایسی ہو

وفا کی رہگزاروں میں اڑنگی باز ہیں سارے
کسی پر دوستوں کی مہربانی ہو تو ایسی ہو

سلوکِ زوجۂ اوّل سے بھی عبرت نہیں پکڑی
مسلسل آرزوئے عقدِ ثانی ہو تو ایسی ہو

لو اس ہفتے کو بھی سسرالیوں کے نام ہے سنڈے
مقدر میں بلائے ناگہانی ہو تو ایسی ہو

سگانِ خوباں دہلائیں، مگر ہم سر کے بل جائیں
سرِ کوئے نگاراں آنی جانی ہو تو ایسی ہو

جو بچہ دیکھے پکچر میں اُسی پر ریجھ کر بولے
ہمارے پیار کی کوئی نشانی ہو تو ایسی ہو

تری بیوٹی سے میک اپ کی تہیں کھرچے، تجھے سمجھے
ترے بھرے میں نہ آئے، جوانی ہو تو ایسی ہو

جھکی رہتی ہیں گھر میں مونچھیں ہیبت خان لالہ کی
کہ اونچا بولنے نہ دے پٹھانی ہو تو ایسی ہو

پئے آتش نشانی فائٹرز کو کال جا پہنچے
سرِ بزمِ سخن شعلہ بیانی ہو تو ایسی ہوا

نوید ظفر کیانی

کر کے سسروں نے فون ویری سون
خشک کرنا ہے خون ویری سون

آج جن حرکتوں پہ تھو تھو ہے
یہی ہوں گی فنون ویری سون

خیر اندیشی پر نہ جا اُس کی
کھائے گا بھون بھون ویری سون

جب ہو دیدوں پہ حسن کی پٹی
کیسے اُترے جنون ویری سون

کتنے برسوں سے کہہ رہا ہے کوئی
آ رہا ہوں میں سون ویری سون

یہ ہنی مون پر کھلے گا میاں
نہ ہنی ہے نہ مون ویری سون

کاش ہم تم ہوں اس طرح جیسے
میم کے ساتھ نون ویری سون

قرض لے کر نہ اس قدر پھولو
دینا پڑتا ہے ڈون ویری سون

کیوں دسمبر میں ہجر کا رونا
لوٹ آئے گا جون ویری سون

فیس بک پر تو بن کے رہ جائے
ہر چول افلاطون، ویری سون

سچ کو سنتے ہی کیوں ادھڑنے لگی
تیرے لہجے کی اون ویری سون

کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا ہم کو
ارتقاء یا سکون، ویری سون

جونہی اُترا بخارِ عشق ظفرؔ
ہم لگے کارٹون ویری سون

شوکت جمال

سب نہیں ہیں صرف ڈورے ڈالنے والوں کے گھر
ہیں ترے کوچے میں ہم سے چاہنے والوں کے گھر

ایک لیڈر کی خبر چھپنے سے دیکھو کیا ہوا
پڑ گیا چھاپہ سویرے چھاپنے والوں کے گھر

مانگنے والوں کو دے دے کر ہوئے کنگال ہم
مانگنے اب جا رہے ہیں مانگنے والوں کے گھر

ہر گلی کوچے میں ہوتے ہیں شریفوں کے مکاں
اور کچھ ہوتے ہیں اُن میں جھانکنے والوں کے گھر

قرض ہو درکار تو گھر خاص ہیں میرے لئے
میں کبھی جاتا نہیں ہوں ٹالنے والوں کے گھر

جاننے والوں کے آنے کی خبر ملتے ہی میں
خود چلا آتا ہوں اُٹھ کر جاننے والوں کے گھر

اہلِ خانہ کی ہمارے کاہلی تو دیکھئے
بات چھیڑی ہے ہمارے سامنے والوں کے گھر

فہیم الدین ہاشمی

کیجئے کوئی کام سڑکوں پر
آ نہ جائے عوام سڑکوں پر

عشق میں یہ چلن بنایا ہے
دن محلے میں، شام سڑکوں پر

شاعری آ گئی ہے آؤٹ ڈور
کہہ رہے ہیں کلام سڑکوں پر

اب نہ لکھیں گے ساحلوں پہ ہم
تیرا لکھیں گے نام سڑکوں پر

اک ٹرک سے لگا لیا ہے دل
بس کا انجن ہے جام سڑکوں پر

زندگی جیسے ٹائروں کی طرح
لمحہ لمحہ تمام سڑکوں پر

انعام الحق معصوم صابری

مجھے تو عشق ہے چائے سے میرے یار سردی میں
کہ وہ تو خوب ہاتھوں سے پلائے پیار سردی میں

مزہ تو یہ بہت دیتے ہیں لوگوں کو مرے ہمدم
''کبھی چائے، کبھی سگرٹ، کبھی نسوار سردی میں''

کبھی نزلہ کبھی کھانسی، یہی تحفے ہیں موسم کے
ہوا جاتا ہے رہنا پھر بہت دشوار سردی میں

مزہ آتا ہے قلفی کا کبھی بوتل کے پینے کا
مگر پھر ہو وہ جاتے ہیں یونہی بیمار سردی میں

رضائی میں وہ گھستے جا رہے ہیں سارے دیکھو تم
وہ اک دو تین بھائی اور چاچا چار سردی میں

''لہو کو اس طرح اب گرم رکھتا ہے مرا شاہیں''
کسی سنسان رستے پڑھنا استغفار سردی میں

تو کیوں معصوم میرے سامنے آتے نہیں ہیں اب
گلی میں اس طرح پھرنا تو ہے دشوار سردی میں

شاہین فصیح ربانی

جس کے خلاف کوئی وڈیرا ہے آج کل
تنگ اس کے گرد پلس کا گھیرا ہے آج کل

اس سے غریب شہر کی بچتی نہیں ہے جیب
جو حکمران ہے وہ لٹیرا ہے آج کل

حد سے گزر گیا ہے ملاوٹ میں عہدِ نو
سو واٹ کے بلب میں اندھیرا ہے آجکل

ڈگری کو ہے پلیٹ کے بکسے میں رکھ دیا
انڈوں کا روزگار جھیرا ہے آج کل

پرسوں خبر نہیں ہے کہ دل کس کے پاس ہو
اتنی تو پکی بات ہے، تیرا ہے آج کل

پھرتا ہے پیٹوؤں کی نظر سے چھپا ہوا
''فدوی بشر نہیں ہے، بٹیرا ہے آج کل''

خود مجھ کو بھی فصیح نہیں یاد آ سکا
مشہور کوئی شعر جو میرا ہے آج کل

شہواز انور

تم کو چائے پہ بلاؤں گا چلا جاؤں گا
بات مجنوں سے کراؤں گا چلا جاؤں گا

میں تو سگریٹ کو ہاتھوں سے لگاؤں گا نہیں
کوک میں تم کو پلاؤں گا چلا جاؤں گا

تم کو جوتا جو ہے کھانے کی یہ عادت اب تک
تم کو پھر سے میں کھلاؤں گا چلا جاؤں گا

شوق تیرا میں تو پورا بھی کروں گا دل سے
مانگ کانٹوں سے سجاؤں گا چلا جاؤں گا

دیکھ کر جس کو جلاتے جو میاں تم بیڑی
دیپ وہ آج بجھاؤں گا چلا جاؤں گا

سب کو بندر کی ہی اولاد جو کہتا ہے یاں
اس کو بندر سے کٹاؤں گا چلا جاؤں گا

تم تو بیمار ہو نزلے کی شکایت بھی ہے
تم کو بارش میں نچاؤں گا چلا جاؤں گا

سب کو بھاتی ہیں ادائیں تو اسی کی انور
میں بھی لیلیٰ کو بلاؤں گا چلا جاؤں گا

نور جمشید پوری

محفل میں آ کے ہاتھ ملانے کا شکریہ
غیروں سے مجھ کو اپنا بتانے کا شکریہ

دل کو یقیں تھا شعر چراتے ہو تم مگر
میری غزل مجھ ہی کو سنانے کا شکریہ

سر میرا اونچا فخر سے تم نے تو کر دیا
میکے میں آ کے مجھ کو منانے کا شکریہ

جا کر کچن میں مجھ سے پکایا گیا نہ جب
ہوٹل میں لا کے لنچ کرانے کا شکریہ

میری سہیلیوں کی تواضع کے واسطے
بریانی تازہ تازہ پکانے کا شکریہ

مہنگی دلا کے ساڑیاں اور تھوڑے زیورات
میری پڑوسنوں کو جلانے کا شکریہ

اٹھنے سے قبل میرے، بنا کر مرے لئے
بستر پہ مجھ کو چائے پلانے کا شکریہ

آتی ہے نیند سن کے جو نغمے مجھے وہی
ہر شب سنا سنا کے، سلانے کا شکریہ

مہندی لگا کے بیٹھی تھی جب نام کی ترے
ہاتھوں سے مجھ کو کھانا کھلانے کا شکریہ

چاہت تمام الفتیں مجھ پر لٹا کے پیار
چہرے کا میرے نور بڑھانے کا شکریہ

پروفیسر ریاض احمد قادری

جہاں میں ہیں بڑے شیطاں بھکاری
ہے کہتا کون، ہیں انساں بھکاری

ذلالت میں بہت ڈوبے ہوئے ہیں
مجھے لگتے ہیں یہ حیواں بھکاری

سکوں ان کو میسر ہی نہ ہو گا
رہیں گے زیست میں حیراں بھکاری

کوئی ان کو بھلے ٹکڑے کھلا دے
رہیں گے پھر بھی یہ شاداں بھکاری

ہزاروں نوٹ گو خیرات لے لیں
نہ ہو پائیں کبھی فرحاں بھکاری

نہیں روٹی یہ محنت سے کماتے
تبھی تو کرتے ہیں ہاں ہاں بھکاری

یہ لے کر بھیک کر لیتے ہیں نشہ
جہازوں کی بنے ہیں جاں بھکاری

بھنکتی مکھیاں لگتے ہیں مجھ کو
ہیں کرتے ہر گھڑی ساں ساں بھکاری

کوئی جو دودھ نہ خیرات میں دے
چرا لیتے ہیں اس کی گاں بھکاری

جہاں کوئی نہیں اپروچ رکھتا
نظر آتے ہیں ہم کو واں بھکاری

اقبال شانہ

ساری دنیا میں ہے جس کا غلغلہ
آدمی اندر سے ہے وہ کھوکھلا

حضرتِ آدم نے کی تھی ابتدا
چل رہا ہے آج تک وہ سلسلہ

اب امورِ خارجہ سے ہم کو کیا
ہم تو ہیں یارو وزیرِ خارجہ

اُس نے اِس انداز سے دیکھا مجھے
شہرِ دل میں آ گیا ہے زلزلہ

پھینک دے جنت میں یارب تو مجھے
ہو مرے حق میں کرم کا فیصلہ

دل کے سو ٹکڑے بنا کر کھیلنا
ہے یہی محبوب اُن کا مشغلہ

شعر فرماتے ہیں یا جنتے ہیں آپ
آپ شاعر ہیں یا کوئی حاملہ

قتل کر دو یا بنا لو یرغمال
دیکھ لو شانہ میاں کا حوصلہ

ذیابیطس

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

زندگی ہمیشہ شیریں نہیں ہوتی۔ اکثر اوقات بظاہر ایک خوش باش شخص اندر سے بہت دکھی اور غمزدہ ہوتا ہے، جیسے کہ ذیابیطس کا مریض مٹھاس سے لبریز ہونے کے باوجود مرض کی تلخی کے باعث کرب و اذیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ کسی مرض کا شکار مریض یقیناً اپنی بیماری سے خوش نہیں ہوتا، مگر خوش طبع شعراء اس بابت میں طنز و مزاح محض دل بڑھانے کے لئے کرتے ہیں۔ پژمردگی و افسردگی کے لئے زندہ دلی کسی نعمت سے کم نہیں لہذا اس مضمون میں شامل تخلیقات کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ انٹرنیٹ پر جب Jimmy kennel نے کسی بلاگ میں ذیابیطس کے مریضوں پر کوئی چٹکلہ کہا تو اس پر ایک تہلکہ سا مچ گیا اور مریضوں خصوصاً انسولین پہ منحصر ''ذیابیطس ٹایپ ون'' والے بچوں کے والدین نے اس بات کا بہت زیادہ برا منایا کہ ذیابیطس کی یہ قسم غذائی بد احتیاطی کے بجائے بنیادی طور پر موروثی ہے۔ جبکہ ''ذیابیطس ٹائپ ٹو'' موروثی کے علاوہ موٹاپے کی وجہ سے بھی ہوتی ہے اور مٹاپے کو مریضوں کی اصلاح کے لئے طنز و تمسخر کا اکثر نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ذیابیطس جسے عرف عام میں شوگر کی بیماری سے موسوم کیا جاتا ہے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں پائے جانے والی بہت ہی عام سی بیماری بنتی جارہی ہے، جس کے مریضوں کی تعداد اب ترقی پزیر ممالک میں بھی بہت بڑھ چکی ہے۔ دنیا بھر میں ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد کے لحاظ سے پاکستان ساتویں نمبر پر آتا ہے۔ عموماً لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بیماری زیادہ میٹھی چیزیں کھانے سے ہوجاتی ہے جب کہ دراصل یہ ایک بہت پیچیدہ مرض ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں اور بہت سے عوامل اس مرض میں کارفرما ہوتے ہیں۔

چینی کی نایابی

جب سے اس ملک میں نت نئے اقتصادی معاہدے ہورہے ہیں چینی کی کمی ہو تو ہو چینیوں کی ہرگز کمی نہیں ہورہی۔ ایک طرف شوگر کا مریض ہے جس کی شوگر سنبھالے نہیں سنبھلتی اور اسے کم کرنے کے لئے وہ ہر جتن کرتا ہے تو دوسری طرف خلق خدا کی ایک کثیر

تعداد شکر کی گرانی یا نایابی پہ بین شروع کردیتی ہے۔

زندگانی کی حقیقت جانتے ہیں تلخ ہے
اپنے لہجے کو مگر کچھ ''انگبینی'' کیجئے
کہہ رہے ہیں لیڈرانِ قومِ جمہوری پسند
چینی مہنگی ہے تو ہنس کر نکتہ چینی کیجئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شکر کا مرثیہ

شکر کے قحط سے ہر شخص بیقرار ہے آج
خدا کی مار نہیں ہے شکر کی مار ہے آج
شکر کے قحط نے گڑ کو سکھا دیئے انداز
دعا قبول ہو یارب کہ گڑ کی عمر دراز
شکر کے غم سے پریشاں ہے ہر امیر و غریب
یہ کہہ رہا تھا کوئی شخص گھنٹہ گھر کے قریب
کوئی تو صورت امید اب نظر آجائے
خدا کرے مجھے پیشاب میں شکر آجائے

نہ چھوٹے ہاتھ سے کس طرح دامنِ نمکیں
کہ اب تو وہ لبِ شیریں بھی ہوگئے نمکیں
شکر نے مار دیا ملک کے طبیبوں کو
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی غریبوں کو
خمیرہ گاؤ زباں گڑ میں بن تو جائے گا
مگر سوال یہ ہے اس کو کون کھائے گا
شکر کا قحط ہے یارو نمک کی چائے پیو
غرض یہ ہے کہ مقدر جو کچھ پلائے پیو
ہوئی ہے ہند میں جب سے شکر کی گاڑی لیٹ
شکر لبوں نے بھی اپنا بڑھا دیا ہے ریٹ
اگرچہ شربتِ دیدار اب بھی ہے رنگیں
مگر شکر کی جگہ اس میں پڑگئی سکرین
شکر جو مل میں تھی کیا ہوگئی خدا معلوم
''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم''
نہ میہماں کے لئے ہے نہ میزباں کے لئے
شکر بنی ہے تجمل حسین خاں کے لئے
کھلائے کیسے کوئی دعوتوں میں اب زردہ
شکر بلیک سے ملتی ہے وہ بھی در پردہ
شکر ہے یہ اسے میزانِ حق پہ مت تولو
شکر ملے گی مگر پہلے جھوٹ تو بولو
یہ کہہ رہا تھا ''ڈی ایس یؤ'' سے اک شکر خورا
مجھے تو دیجئے کم از کم شکر کا اک بورا
کھڑا ہے راشننگ آفس پہ ناحق اے بدھو
نمک حرام شکر کھا کے کیا کرے گا تو
شکر ملے گی اسے جس نے دی یہ عرضی ہے
کہ آج میرے بھتیجے کا عقدِ فرضی ہے
ہوا ہے قحط شکر کا عوام پر یہ اثر
جو پہلے شیر و شکر تھے وہ اب ہیں شیر و شتر
نہ اب وہ سازِ وفا ہے نہ وہ نوا سنجی
کہ اب شکر کی جگہ عام ہے شکر رنجی

دلاور فگار

ذیابیطس

ذیابیطس یا شوگر ایک ایسا دائمی اور غیر متعدی مرض ہے کہ جس میں نہ مرض مریض کا پیچھا چھوڑتا ہے اور نہ مریض ڈاکٹر کا پیچھا۔ دیکھا جائے تو اس کے باعث مریض کی مصروفیت اور ڈاکٹر کا روزگار جاری وساری رہتا ہے۔

مریضِ غم کو لاچاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی شوگر کی بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ارشد میر

پرھیز
مثل مشہور ہے پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ پرہیز بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

پرہیزانہ پرہیز
یہ وہ پرہیز ہے جو کسی بھی مرض کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اگر کیا جائے تو اس مرض کے وقوع پذیر ہونے کے بہت کم امکانات ہوجاتے ہیں۔شوگر کی بیماری میں صرف مٹھاس کا دخل نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ کھانا بھی اس مرض کا شاخسانہ بن سکتا ہے۔

ہوا یرقان بیگم کو وہ رس گنے کا پیتی ہے
مجھے ڈر ہے وہ اس رس کی کہیں خوگر نہ ہوجائے
یونہی پھر لبلبہ بنتا ہے اک دن بلبلہ آخر
کہیں میری طرح اب اس کو بھی شوگر نہ ہوجائے

ضیاالحق قاسمی

کھائی ہے ناپ تول کے ہر چیز خوردنی
ہر وقت ایک مسئلہ ہے اجتناب کا
شوگر نہ ہو کسی بھی مسلمان کو اے خدا
مشکل سا ایک سوال ہے یہ بھی حساب کا

انور مسعود

مریضانہ پرہیز
دوسری قسم کا پرہیز وہ پرہیز ہوتا ہے کہ جب مرض کی ابتدا ہوچکی ہوتی ہے اور اب دوائی لینا ناگزیر ہوجاتا ہے اس پرہیز سے دوائی کی مقدار میں کمی کی جاسکتی ہے اور مزید پیچیدگیوں سے بھی بچا جاسکتا ہے ۔

وہ چکھ سکتی نہیں ہے ایک بھی ماشہ سموسے کا
میں کھا سکتا نہیں ہوں ایک رتی بھی شکر قندی
ترے آزاد بندوں میں میری زوجہ نہ میں مولا
نمک کی اس کو پابندی مجھے میٹھے کی پابندی

انور مسعود

محاوراتی پرہیز
مزاحیہ شاعر کی حس مزاح جب بیدار ہوتی ہے تو اسے بہت دور کی سوجھتی ہے۔

غیبت کرنی پڑ جاتی ہے بزم سے جانے والوں کی
بی۔پی ہائی ہوجاتا ہے باتیں پیٹ میں رکھنے سے
تلخ کلامی ٹھیک نہیں ہے کرتا ہوں مجبوری سے
شوگر بڑھ جاتی ہے بھائی میٹھی باتیں چکھنے سے

ڈاکٹر انعام الحق جاویدؔ

شوگر کے مریض کے سرہانے
کہتا تھا طبیب ہائے ہائے
کس اہل زباں کے مشورے پر
جامن کی جگہ گلاب جامن کھائے

طٰہٰ خان

کوئی میٹھی چیز کھائی ہے نہ پینی ہائے ہائے
لے ہی بیٹھی آخرش چینی کمینی ہائے ہائے
شربتِ دیدار سے پرہیز تک تو ٹھیک تھا
میٹھی میٹھی گفتگو پر نکتہ چینی ہائے ہائے

ڈاکٹر انعام الحق جاویدؔ

جب سے کچھ آنے لگا ہے انہیں شوگر جوہرؔ
گھر میں بیٹھے ہوئے نمکین غزل کہتے ہیں

جوہرؔ سیوانی

چینی اور چائے
میں کہ اپنے گاؤں کا نمکین لسی نوش تھا
جانے کیسے ہوگیا چائے کا خوگر ہائے ہائے
ڈائننگ ٹیبل پہ میٹھا بیٹھ کر کھاتا تھا میں

ہوگئی بیٹھے بٹھائے مجھ کو شوگر ہائے ہائے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

میں کہ واقف ہی نہیں تھا چائے کے کردار سے
بے طرح گھائل ہوا شوگر کے میٹھے وار سے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

چائے ضرور پیجیے لیکن جناب من
چائے کے کپ میں اور نہ چینی ملائیے

انور مسعود

شربتِ دیدار

ڈر کے شوگر ریٹ کی بڑھتی ہوئی رفتار سے
یہ سلوک اچھا نہیں شوگر کے اک بیمار سے
میٹھی نظروں سے کسی شیریں دہن کو دیکھ کر
کام لے سکتا نہیں شیرینیٔ گفتار سے
اور اب خطرہ یہ ہے کہ تنگ آ کر ڈاکٹر
لکھ نہ دے پرہیز اک دن شربتِ دیدار سے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اس کو شوگر ہی نہ ہو جائے یہ اندیشہ ہے
جس نے بھر بھر کے پیا شربتِ دیدار بہت

عرفان قادر

باتوں میں مٹھاس

تیشہ زمیں پہ رکھ کے یہ فرہاد نے کہا
اس بار تم سے مل کے مزاجی اداس ہے
دیکھو ذیابطس کا حملہ نہ ہو کہیں
شیریں تمہاری باتوں میں کتنی مٹھاس ہے

طٰہٰ خان

مجھ کو شوگر ہے، اِک اردو کا منافق بولا
صرف خوراک میں نمکین لیا کرتا ہوں
اور یہ اردو بڑی میٹھی زباں ہے بھائی
میٹھی چیزوں سے میں پرہیز کیا کرتا ہوں

امیر احمد (امیر ممکن سہارن پوری انڈیا

تری باتوں میں شیرینی فزوں تر ہوتی جاتی ہے
مجھے ڈر ہے اسدؔ تجھ کو کہیں شوگر نہ ہوجائے

اسدؔ جعفری

یہ تلخ بات ہے ان کے لئے شفاء کا سبب
سحر ملے گی انہیں اب سیاہ راتوں سے
انہیں ہے غصّہ کہ وہ کیوں "مریضِ شوگر" ہیں
کنارہ کش ہیں وہ مدت کے، میٹھی باتوں سے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اس سے بڑھ جاتی ہے بہت شوگر
اپنا غُصّہ نہ اور تیز کریں
میٹھی چیزوں پہ ہے فقط قدغن
میٹھی باتوں سے مت گریز کریں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اتنا زیادہ طاری کرلیا جاتا ہے کہ مریض اس کے خوف سے ہی مزید بیمار ہوجاتا ہے۔ پہلے قطعے میں وہ خوف بیان کیا گیا ہے جب کہ دوسرے قطعے میں تفننِ طبع کے طور پر لاابالی پن اور بے خوفی کا مظاہرہ دیکھیے۔

ذیابیطس سے اِک بے رونقی چھائی ہے گُلشن میں
خدا پھینکے نہ یوں دُشمن کو بھی امراض کے بن میں
ہوئی ہے جب سے شوگر بڑھ گئی ہے احتیاط اُن کی
وہ سالن بھی نہیں کھاتے ہیں اب چینی کے برتن میں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

زہر سے زہر کا ملے تریاق
اس تصور پہ ہم تو جیتے ہیں
نہیں چینی تو کیا ہوا مظہر
چائے چینی کے کپ میں پیتے ہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مفت مشورے اور گھریلو ٹوٹکے

ہمارے ملک میں مریضوں کو مفت مشورے دینا ہر کوئی اپنی سماجی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

مرض تیرے عاشق کو شوگر کا ہے
کریلا دے اس کو مٹھائی نہ دے

شبنم کاروای

کیا سناؤں داستاں لقمانِ خستہ حال کی
عقل کس تحقیق نو پر اس نے استعمال کی
کہہ رہا تھا ایک چینل پر کوئی حاذق حکیم
جن کو شوگر ہو وہ کھائیں ریوڑی چکوال کی

ڈاکٹر عزیز فیصل

زندگی تو زندگی موت کے بعد بھی اس مرض کا خوف دل میں اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ

تھا ذیابیطس کا لاحق عارضہ مرحوم کو
بو گئے احباب کچھ کڑوے کریلے قبر پر

نعیم نیازی

مریض کا رویّہ

ہر مریض اپنی عقل تعلیم اور سماجی تربیت کے مطابق اپنے مرض کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سے زیادہ مریضوں اور ان کے لواحقین سے مرض کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے۔ اور آج کل کے دور میں انٹرنیٹ واٹس ایپ اور فیس بک کے ذریعے اپنا علاج معالجہ کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہوئی شوگر میں میری خود کفالت
لگا ہے میرے اندر کارخانہ

باقر علیم

پاؤ برفی ضرور کھاتا ہوں
چائے پیتا نہیں شکر والی

سرفراز شاہد

مجھ کو شوگر بھی ہے اور پاس شریعت بھی ہے
میری قسمت میں نہ میٹھا ہے نہ کڑوا پانی

انور مسعود

ہمیں تو راس ہے یہ پھیکی چائے
بنا چینی جو پئیں ہو ہمیں کیا
ذیابیطس کا یہ تو فائدہ ہے
اگر مہنگی ہے چینی، ہو! ہمیں کیا؟

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

علاج

ذیابیطس کا کیونکہ کوئی ایسا حتمی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا

جو اس کا مکمل خاتمہ کر سکے لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ یہ مرض علاج کے باوجود بڑھتا جاتا ہے مگر اس بات کو علاج نہ کرانے کا بہانہ نہیں بنانا چاہئے۔

اگر بیمارئ شوگر ہے تجھ کو
نہ کھا بیسن بھی تو اتنا زیادہ
یہ سارا مسئلہ مقدار کا ہے
کریلا بھی نہیں اچھا زیادہ

انور مسعود

پھر انسولین کے ٹیکے پہ پہنچا
جب اک گولی سے اس نے ابتداء کی
نہ پوچھو حالتِ بیمارِ شوگر
"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

انور مسعود

شوگر کی پیچیدگیاں

تنہا ہمارے جسم میں رہتی نہیں شوگر
کرتی ہے دل سے، آنکھ سے، گُردوں سے دوستی
کمزور ان کو کرتی ہے یہ اس قدر سحرؔ
آخر کو چھین لیتی ہے ان سب کی زندگی

فرید سحر

نظمیں

اور آخر میں "ذیابیطس" کے مرض پر لکھی گئیں چند نظمیں حاضر ہیں

۱

ڈاکٹر نے نبض دیکھی، بولا جا کر چیک کرا
یہ بہت موذی مرض ہے اس کو جا کر چیک کرا
ایک بھی ناغہ نہ کر بیٹا برابر چیک کرا
فکر کر صحت کی اپنی روز شوگر چیک کرا
ڈاکٹر کی ہر ہدایت پر عمل کرتا ہوں میں
کھا کے چینی چیک شوگر آج کل کرتا ہوں میں

احمد علوی

۲

وہ مریضانِ ذیابیطس جو آئے ہیں یہاں
ان میں بچے بھی ہیں شامل اور بوڑھے اور جواں
اس زمانے میں کہ جب ہے ملک میں ہر شے گراں
یہ بناتے ہیں شکر بڑھتی ہیں جس سے تلخیاں
خون کی نلیوں میں کولیسٹرول بڑھ جائے اگر
"پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"

خون میں انکے شکر ہے شکر کرتے ہیں مگر
یہ دعا دیتے ہیں انسولین کو شام و سحر
''کاربوہائیڈریٹ'' آجاتے ہیں جس شے میں نظر
کھانے پینے میں کیا کرتے ہیں یہ اس سے حذر

یہ جو میٹھے خون والے ہیں انہیں معلوم ہے
''پینکریٹک جوس'' میں سے ان کے کچھ معدوم ہے

یہ نمک خوارانِ ملت جب کہیں پیتے ہیں چائے
یہ شکر کو دیکھ کر بس صرف کہہ سکتے ہیں ہائے
ڈالتے ہیں یہ ''سوئیٹکس'' اس میں چینی کے بجائے
جس کو اپنی جان پیاری ہو شکر کس طرح کھائے

یہ ہیں وہ فرہاد جو شیریں سے اپنے دور ہیں
ہے ذیابیطس وہ بڑھیا جس سے یہ مجبور ہیں

یہ جو بچے ہیں ذیابیطس کے غم میں مبتلا
یا الہٰ ان کی گاڑی عمر کی ایسے چلا
ان کے قابو آکے دب جائے مرض کی یہ بلا
بچ رہے گا احتیاطوں میں اگر رہ کر پلا

شرط یہ ہے زندگی میں نظم ہو اور انضباط
احتیاط اور احتیاط اور احتیاط اور احتیاط

ہو ذیابیطس جسے اس کی دوا پرہیز ہے
ہے رفیق زندگی یہ دکھ جو درد آمیز ہے
اس کا پھر ورثے میں ملنا بھی تعجب خیز ہے
خاندانی قسم کا دکھ ہے اثر انگیز ہے

ورنہ میٹھا خوں اگر رگ میں رواں ہو جائے گا
''دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا''

سید محمد جعفری

۳

جس وقت بھی رنگ اپنا دکھا دیتی ہے شوگر
ہنستے ہوئے چہروں کو رلا دیتی ہے شوگر
آہستہ دبے پاؤں صدا دیتی ہے شوگر
ہر جسم میں گھر اپنا بنا دیتی ہے شوگر

بڑھ جائے اگر حد سے تو یاد آجاتی ہے نانی
نانی سے عدم میں بھی ملا دیتی ہے شوگر
شوگر میں حسینوں کو میاں گھورنا چھوڑو
مت بھولو کہ اندھا بھی بنا دیتی ہے شوگر
کیا حسن کی انگڑائیاں کیا عشق کی گرمی
انسان کو کوئلہ بنا دیتی ہے شوگر
خالق سے جو غافل رہے صحت تھی جب اچھی
اللہ کی یاد ان کو دلا دیتی ہے شوگر
لڈو ہو جلیبی ہو قلاقند کہ برفی
میٹھوں پہ سبھی پہرے بٹھا دیتی ہے شوگر
جو چاہے وہ کھا سکتا نہیں آدمی یارب
قسمت پہ تری روک لگا دیتی ہے شوگر
دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہے بدن کو
یوں کھوکھلا انساں کو بنا دیتی ہے شوگر
کر خاتمہ یارب تو اب اس میٹھے مرض کا
جینے کی ہر اک آس مٹا دیتی ہے شوگر
زردار بناتی ہے طبیبوں کو یہ شاہدؔ
پیشنٹ کو کنگال بنا دیتی ہے شوگر

شاہدؔ عدیلی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ان کے طنز ومزاح پر مبنی نصف درجن سے زائد شعری مجموعے شائع ہوکر اہلِ ادب سے داد و تحسین پا چکے ہیں۔طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ و شگفتہ نثر کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ارمغانِ ابتسام کے اوّلین کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

سر کا پہلوان اور کامریڈ سراج پنجابی

اتوار کو چھٹی کے باعث ہم مزید دیر سے جاگے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی اور بالکونی سے ہلکی دھوپ کمرے میں آ رہی تھی۔ ہمارے پرانے موبائل فون کا سیٹ بھی خراب پڑا تھا اس لئے ہم گیت بھی نہ سن سکتے تھے، لہٰذا پریس کلب جانے کیلئے ہم نے تیار ہونا شروع کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم لفٹ کے ذریعے بلڈنگ سے باہر نکلے اور شملہ پہاڑی چوک پار کر کے پریس کلب گیٹ کی جانب فٹ پاتھ پر خراماں خراماں چلنے لگے سڑک پر ٹریفک کم تھی اور سامنے والی عمارتوں میں دفاتر بند ہونے کی وجہ سے ماحول میں شور شرابا بھی کم تھا ہم پریس کلب کے صحن میں داخل ہوئے تو وسط والی میز پر بابائے مانیٹرنگ آنکھیں بند کئے دھوپ سینک رہے تھے ہم ان کے پاس جا کھڑے ہوئے کرسی کھسکنے کی آواز پر انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں ہمیں دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''آؤ یار بیٹھو جاڑے کی دھوپ کا اپنا ہی مزا ہے تم تو اب چاند ہی ہو گئے ہو دن کے وقت کلب میں نظر ہی نہیں آتے۔۔۔!''

ہم نے مسکرا کر کہا ''سورج سے میری دیرینہ دشمنی ہے۔۔۔ رات کلب میں گزارنے کے بعد دن بھر سوتا ہوں اور تیار ہو کر فلیٹ سے باہر نکلتے نکلتے شام ہو جاتی ہے!''

فضا میں بازو لہرا کر بولے ''نہ آنے کے ہزار بہانے ہو سکتے ہیں!''

ہم نے قہقہہ لگایا اور انہیں ساتھ لیا اور کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ گئے۔ دروازے کے ساتھ والے بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک جواں سالہ صحافی کچھ بڑبڑا رہے تھے ہم نے قریب سے گزرتے ہوئے سنا تو وہ شعر گنگنا رہے تھے

کس ضرورت کو دباؤں، کسے پورا کرلوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

ہم ٹھٹھک کر رک گئے اور ہمیں یاد آیا کہ ہماری تنخواہ تو ابھی تک بنک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہی نہیں ہوئی، جواں سالہ صحافی اب قدرت سے شکوہ کر رہا تھا ''ہائے ربا تو نے مجھے دل بادشاہ کا دیدیا مگر مجھے تنخواہ مزدور سے بھی کم ملتی ہے۔۔۔!''

بابائے مانیٹرنگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''کاکا! ہم تو بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن تمہارے پاس ابھی وقت ہے صحافت کا پیشہ چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کر لو ورنہ بھوکوں مرو گے کیونکہ اب تبدیلی آ چکی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صحافت کے دن برے سے برے ہوتے جائیں گے!''

ہم دونوں کیفے ٹیریا میں داخل ہو کر کونے والی میز پر جا بیٹھے اسی وقت نیا ویٹر آ کر ہم سے پوچھنے لگا ''کیا کھائیں گے؟''

بابائے مانیٹرنگ اس سے کہنے لگے ''کاکا! اس کا ایک ہی آرڈر ہوتا ہے اسے یاد کر لو۔۔۔ چاولوں کی پلیٹ، سلاد اور قہوے کا گلاس!''

ہم نے مسکرا کر تائید میں سر ہلا دیا۔

ویٹر کھانا لایا تو ہم چاول کھا کر پریس کلب سے نکل کھڑے ہوئے۔ پاک ٹی ہاؤس پہنچے تو دیکھا کہ سرکا پہلوان نے اپنی مخصوص میز پر محفل جما رکھی تھی۔ڈاکٹر خبیث شیطانی اور چھیدا بونگا کے علاوہ بھی تین چار دانشور موجود تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی برابر والی میز پر سے ایک دانشور اٹھے اور ہمارے پاس آ کر کہنے لگے ''میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟''

چھیدے بونگے نے جلدی سے کہا ''حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں دیکھا ہوگا۔۔۔!''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے''نہیں۔۔۔۔ حلقے میں تو یہ مجھے نظر نہیں آئے!''

''آپ حلقے میں کب گئے تھے؟''ڈاکٹر خبیث شیطانی نے اُن سے پوچھا۔

چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے کہنے لگے''گزشتہ ماہ اس اجلاس سے باقاعدہ حلقے میں جا رہا ہوں جس کے دوران کراچی سے آئے مہمان شاعر مسلم شمیم نے کلام سنایا تھا جبکہ دو دانشوروں کی بیوگان کے انتقال پر دعائے مغفرت کی گئی تھی!''

''بیوگان نہیں بیگمات کہیں یار!''ہم نے ٹوک کر کہا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے،انہوں نے سر جھٹک کر کچھ سوچا اور پھر بوکھلا کر جلدی سے اپنی میز پر جا بیٹھے۔ سب دوبارہ ہنسنے لگے۔ اسی وقت این جی او کا نوجوان کارکن پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور چھیدے بونگے سے پوچھنے لگا''کسی فلمی گیت کی کامیابی میں سب سے زیادہ کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟''

چھیدا بونگا حسب عادت سوچے سمجھے بغیر بولا ''فلمساز کا!''

نوجوان نے کاپی میں کچھ لکھے بغیر سرکا پہلوان کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگے''گیت نگار دا۔۔۔!''

شاعر خیال پروازی نے سر ہلا کر ان کی تائید کی،این جی او کے کارکن نے کاپی میں کچھ نوٹ کیا اور ڈاکٹر خبیث شیطانی سے پوچھا تو وہ بولے''میرے خیال میں گلوکار کا سب سے زیادہ اہم کردار ہوتا ہے!''

نوجوان نے ہماری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو ہم نے کہا''موسیقار کا سب سے زیادہ کردار ہوتا ہے جو بے تکی شاعری اور بھدی آواز کے باوجود اچھی دھن بنا کر گیت کو مقبول بنا سکتا ہے!''

وہ سر ہلا کر کاپی میں کچھ لکھنے لگا۔

خیال پروازی پوچھنے لگے'' موسیقی کے سبھی ماہرین خاں صاحب کیوں ہوتے ہیں؟''

ہم نے مسکرا کر کہا'' کچھ ماہرین موسیقی خاں صاحب نہیں بھی ہوتے!''

موسیقار کا سب سے زیادہ کردار ہوتا ہے جو بے تکی شاعری اور بھدی آواز کے باوجود اچھی دھن بنا کر گیت کو مقبول بنا سکتا ہے۔

خیال پروازی جھلا کر بولے''کوئی مثال دے سکتے ہیں؟''

ہم نے کہا'' فلم میوزک ڈائریکٹر خواجہ خورشید انور، ٹی وی پروڈیوسر خواجہ نجم الحسن اور ریڈیو پروڈیوسر شاہد احمد دہلوی روایتی خاں صاحب گھرانوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے!''

پروفیسر صبر ایوبی لقمہ دیتے ہوئے کہنے لگے'' بلکہ ان کا لاہور اور دلی کے علمی و ادبی گھرانوں سے تھا،شاہد احمد دہلوی ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے جبکہ خواجہ خورشید انور علامہ اقبال کے خالو تھے!''

این جی کا کارکن کاپی میں کچھ نوٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔

چھیدا بونگا ہم سے پوچھنے لگا'' آپ نے بلغاریہ کی نابینا خاتون وانگا پینڈو کی نئے سال کے دوران جنوبی ایشیا میں سونامی آنے کی پیش گوئی پڑھی ہے؟''

ہم نے برا سا منہ بنا کر کہا'' سونامی آنے کی پیشین گوئی اگر براعظم ایشیا کے بجائے صرف پاکستان کے حوالے سے ہوتی تو درست قرار دی جا سکتی تھی!''

اس پر محفل میں قہقہہ بلند ہوا اور ارد گرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دانشور چونک کر ہمیں گھورنے لگے۔

سرکا پہلوان کی عقبی میز پر بیٹھے ہوئے دانشور ہماری گفتگو میں

دخل دیتے ہوئے بولے'' موجودہ حکومت درپیش سنگین چیلنجز کا مکمل ادراک رکھتی ہے اور ورثے میں ملنے والے مسائل کے حل کیلئے تمام دستیاب وسائل کو بروئے کار لا کر بہت جلد مربوط لائحہ عمل تشکیل دے گی اور۔۔۔!''

سر کا پہلوان انہیں ٹوکتے ہوئے دھاڑ کر بولے'' تہاڈا تعلق ڈی جی پی آر نال تے نئیں؟''

وہ حیرانی سے آنکھیں جھپکا کر کہنے لگے'' آپ کو کس نے بتایا ۔۔۔؟''

ہم نے ہنستے ہوئے کہا'' آپ کے مخصوص الفاظ نے جو صرف صوبائی وزراء کے سرکاری ہینڈ آؤٹ میں استعمال ہوتے ہیں!''

باقی لوگ بھی مسکرانے لگے اچانک دانشور ساجد سمن آبادی ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے رُک کر ہم سے کہنے لگے'' میں نے علم نگر میں کافی ہاؤس پر آپ کا مضمون پڑھا تھا آپ نے اچھا لکھا تھا میں نے کسی سے سنا تھا کہ کافی ہاؤس میں بیٹھنے والوں کو کینسر ہو جاتا تھا؟''

سر کا پہلوان بھنا کر بولے'' سنی سنائی تے اعتبار ناں کرلیا کرو!''

ہم نے ہنس کر کہا'' کافی ہاؤس میں بیٹھنے سے نہیں البتہ کافی پینے سے کینسر ہو جاتا ہوگا!''

ساجد سمن آبادی جھلا کر بولے'' کافی ہاؤس میں بیٹھنے والے لازمی طور پر کافی بھی پیتے ہوںگے!''

ہم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا'' یہ ضروری نہیں۔۔۔ میں سترہ برس سے پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ رہا ہوں لیکن میں نے آج تک کبھی چائے نہیں پی!''

'' کیا واقعی؟'' وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

چھیدا بونگا شرارت سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا'' یہ صحافی ہیں مگر سگریٹ بھی نہیں پیتے!''

'' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ بوکھلا کر بولے، سر کا پہلوان بھی مسکرا کر کہنے لگے'' ایہہ کشمیری ہو کے گوشت وی نئیں کھاندا!''

ساجد سمن آبادی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

سب نے زوردار قہقہہ لگایا اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دانشور ہمیں گھورنے لگے۔ پروفیسر صبر ایوبی کہنے لگے۔'' حیرت ہے گوشت کھانے کے حوالے سے کشمیری لوگ تو ڈاکٹر کی ہدایت بھی نظر انداز کر دیا کرتے ہیں اور آپ۔۔۔!''

ہم نے مسکرا کر کہا'' میں بھی ڈاکٹر کی ہدایت کو نظر انداز ہی کر رہا ہوں!''

'' کیا مطلب؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگے

ہم نے بتایا'' مجھے ڈاکٹر ہدایت کرتا رہتا ہے کہ گوشت کھایا کرو!''

شاہد احمد دہلوی ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے جبکہ خواجہ خورشید انور علامہ اقبال کے خالو تھے۔

اس پر محفل دوبارہ کشت زعفران بن گئی اور ہم اِردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دانشوروں سے نگاہیں چرانے لگے۔

اسی وقت شاعر گل باغبانپوری پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوئے ان کا حلیہ دیکھ کر سبھی چونک پڑے۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے جبکہ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی، سر کا پہلوان نے ان سے پوچھا'' کسے نال لڑ کے آیا ایں۔۔۔؟''

وہ برا سا منہ بنا کر بولے'' نہیں۔۔۔ موٹر سائیکل چلا کر آ رہا ہوں!''

'' سر کے بل موٹر سائیکل چلا رہے تھے؟'' چھیدے بونگے نے سوال کیا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے وہ جھلا کر کہنے لگے '' ہیلمٹ پہن کر موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور کنگھی جیب میں رکھنا بھول گیا تھا!''

پروفیسر صبر ایوبی بولے'' ہیلمٹ کا استعمال بہت ضروری ہے ٹریفک حادثے کی صورت میں موٹر سائیکل سوار کا سر محفوظ رہتا ہے ۔۔۔!''

'' جسم کا چاہے قیمہ بن جائے سر البتہ محفوظ رہتا ہے!'' ڈاکٹر خبیث شیطانی نے لقمہ دیا۔

پروفیسر صبر ایوبی کہنے لگے" بھئی میں تو ہیلمٹ کی پابندی لگانے والے سابق جج ہائیکورٹ اور اس پر سختی سے عمل کروانے والے موجودہ چیف ٹریفک آفیسر کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں!"

ہم نے مسکرا کر کہا" سارے لاہوریئے ان دونوں کو خراج تحسین پیش کرتے رہتے ہیں!"

خیال پروازی کہنے لگے" میرا بیٹا تو صبح سے شام تک سارا دن دونوں کو خراج تحسین پیش کرتا رہتا ہے !"

" سارا دن کیوں؟" ہم نے حیرت سے پوچھا

کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے" میرا بیٹا گولیاں، ٹافیاں بنانے والی کمپنی میں سیلز مین ہے اور اسے سپلائی دینے کیلئے موٹر سائیکل پر کریانہ و جنرل سٹورز پر جانا پڑتا ہے!"

ہم اور سرکا پہلوان ہنس پڑے مگر باقی سب نے ہنسی کا گلا گھونٹ دیا انہیں شاید توہین عدالت کا ڈر تھا۔ این جی او کا کارکن نوجوان باہر جاتے ہوئے ہمارے قریب رک کر پوچھنے لگا" آپ کو پہاڑی، ریگستانی اور میدانی علاقوں میں سے کون سا علاقہ پسند ہے؟"

ہم نے کہا" میں تو زندگی کی باقی مدت بھی میدانی علاقے میں ہی بسر کرنا چاہوں گا!"

اس نے سرکا پہلوان کی طرف دیکھا تو وہ اپنے جثے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے" یار میں پہاڑی یاں ریگستانی علاقے وچ نئیں رہ سکدا!"

چھیدے بونگے نے جلدی سے علامہ اقبال کا شعر پڑھ دیا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

ہم دونوں نے غصے سے چھیدے بونگے کو گھورا، این جی او کے کارکن نے ڈاکٹر خبیث شیطانی سے سوال کیا تو وہ کہنے لگے " پہاڑی علاقے میں چند روز گزارے جا سکتے ہیں میں ہر سال گرمیوں میں کوہ مری جایا کرتا ہوں البتہ ریگستان سے مجھے ڈر لگتا ہے ہم میدانی علاقے کے لوگ باہر جا کر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے!"

اسی وقت سرکا پہلوان کے پنجابی شاعر دوست کامریڈ سراج پنجابی آ گئے۔ ڈاکٹر خبیث شیطانی نے ان سے پوچھا" کامریڈ! آپ فیض امن میلے میں نظر نہیں آئے؟"

برا سا منہ بنا کر بولے" مینوں فیض تے اودھی شاعری پسند نئیں!"

ہم نے حیرانی سے پوچھا" یار آپ کس قسم کے کامریڈ ہو!"

بھنا کر بولے" میں پنجابی شاعر پہلاں تے کامریڈ بعد وچ آں۔۔۔ فیض میرا گرائیں تھا ہم دونوں کے آبائی گاؤں ایک ہی تحصیل و ضلع میں قریب قریب واقع ہیں۔ فیض نے جٹ پنجابی ہون دے باوجود ماتری بولی وچ شاعری نئیں سی کیتی۔۔۔!"

سرکا پہلوان ان کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے" کہندے تے تسی ٹھیک ای او!"

چھیدا بونگا جلدی سے کہنے لگا" فیض نے پنجابی شاعری بھی کی تھی یہ ان کا ہی تو شعر ہے۔۔۔

نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے ناں پایا

دوسرا مصرعہ سننے سے پہلے ہی وہ چھیدے بونگے کو گھورتے ہوئے اُٹھ کر کونے والی میز پر جا بیٹھے۔ سرکا پہلوان نے چھیدے بونگے کو زور سے دھپ لگائی تو وہ لڑکھڑا کر کرسی سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا، تاہم جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سرکا پہلوان کو گھورتا اور لنگڑاتا ہوا پاک ٹی ہاؤس سے باہر نکل گیا۔ اسی وقت ویٹر چائے لے آیا اور سب خاموشی سے چائے پینے لگے۔

میم سین بٹ یا محمد سرفراز بٹ صاحب صحافت سے وابستہ ہیں۔ روزنامہ "جناح" میں ہائیڈ پارک" کے عنوان سے کالم لکھتے تھے، اب کسی اور اخبار سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ غالباً اس کی واحد وجہ یہی ہے جو اس کالم میں بیان کی گئی ہے۔ بٹ صاحب نے لاہور کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کے بیشتر کالموں میں لاہور سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" پر روزِ اوّل سے خصوصی کرم فرما رہے ہیں۔

اے مرے جوتے مرے ہمدم، مرے دیرینہ یار!
اے میرے پائے شکستہ کے انیس و غمگسار
آج تیری خستہ حالی نے یہ ڈھایا ہے ستم
کر رہا ہوں میں جدا تجھ کو بہ چشمِ اشکبار

کیا کروں مجبور ہوں تیرے ہزاروں ہول سے
میرے تلوے ہی نکل پڑتے ہیں باہر سول سے

تو کہ پچھلے آٹھ برسوں سے تھا میرا ہمسفر
ایک پل کی بھی جدائی تھی گراں اعصاب پر
ہاٹ ہو، بازار ہو، دفتر ہو یا بیت الخلاء
تجھ کو پاؤں سے لگائے رکھتا تھا شام و سحر

جب بھی مسجد میں عبادت کو پہنچتا میں غریب
تجھ کو رکھ دیتا تھا پیچھے عین پیروں کے قریب

میری خاطر کتنے غم کی کشتیاں کھیتا تھا تو
ٹھوکریں لگتی تھیں مجھ کو، سسکیاں لیتا تھا تو
وضعداری کا یہ عالم تھا کہ لغزش پر مری
راستے بھر کی غلاظت خود پہ مل لیتا تھا تو

آج لیکن وہ روایت کشتۂ تنقید ہے
تیرے بدلے اب مجھی پر جانور کی لید ہے

تیری قیمت کب ادا ہو پاتی مجھ کنگال سے
وہ تو نکلی تھی سسر صاحب کے بیت المال سے
تیری خاطر کر لیا تھا میں نے ایجاب و قبول
اِک عدد بیگم بھی لے آیا تھا میں سسرال سے

جلد بازی تو نے کی، بیگم سے سبقت لے گیا
وہ سلامت رہ گئیں، تو داغ فرقت دے گیا

ہو گئی تھی خستگی اب تیری صحت میں دخیل
جوڑ بند اُدھڑے ہوئے، اُکھڑی ہوئی ہر ایک کیل
سول چھلنی ہو چکے تھے مستقل گھسنے کے بعد
راہ میں گم ہو چکی تھی داہنے پاؤں کی ہیل

خوف سے موچی بھی رہتا تھا نظر گاڑے ہوئے
جب اُسے تو دیکھتا تھا اپنا منہ پھاڑے ہوئے

عام ہے چڑھتی گرانی کا جو چرچا آج کل
صاف ظاہر ہے، نہ مل پائے گا پھر تیرا بدل
سوچ بھی سکتا نہیں میں دوسری شادی کی بات
تو بخوبی جانتا ہے ایک کا ردِ عمل

میں برہنہ پائی کی چکی میں اب پس جاؤں گا
رفتہ رفتہ ایک دن تیری طرح گھس جاؤں گا

فیس بُک

جو بھی کرنی ہو پڑوسن سے وہ ہر اک بات ڈال
فیس بک پر اب محلے بھر کے تُو حالات ڈال

ہو کہیں ختنے ، عقیقے ، عقد یا مہندی کی رسم
بے جھجک اب ساری تصویریں بہ عنوانات ڈال

اس گلوبل گاؤں میں ڈالے گا تجھ پر کون ہاتھ
بیچ جھگڑے میں کسی کے تُو بھی اپنی لات ڈال

داد لینی ہو تو دے ہر ایک کو اچھے "کمنٹس"
اور اس کے بعد اپنی ساری تخلیقات ڈال

اب کلیجی ، پھیپھڑے ، دِل ، بیچنا آسان ہے
آ کے انٹرنیٹ پہ جو چاہے وہ سوغات ڈال

دوستی آسان ہے بے چہرگی کی آڑ میں
بن کے تُو اس کی سہیلی اپنے سب جذبات ڈال

چھینکنے اور کھانسنے تک ہر خبر اب نیٹ پہ ہے
گھر پہ اے اخبار والے اب نہ اخبارات ڈال

کون لے گا تجھ سے مظہر اتنی کڑوی ادویات
ان میں کچھ کُشتے حکیمی ، کچھ مُربہ جات ڈال

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

برس بیس شادی کے اُن کے گزرے ہیں
کوئی دن نہ گزرا، نہ جب وہ لڑے ہیں
اسمبلی کے گویا مخالف دھڑے ہیں
ہمیشہ اُلٹ سمت دونوں کھڑے ہیں
اِدھر یہ اڑی ہیں اُدھر وہ اڑے ہیں
مگر پھر بھی دس بچے اُن کو پڑے ہیں
نہ یہ مانتے ہیں نہ وہ مانتی ہے
مگر لوگ کہتے ہیں، سب شانتی ہے

اگرچہ ہے "لائیف" بہت اِن کی سادہ
نہ بادی غذا اِن کی، ساغر، نہ بادہ
لڑائی میں پڑ جائیں یوں وہ مبادا
وہ باہر ہی رہتے ہیں گھر سے زیادہ
اچانک ہی ہوتا ہے ان میں "فسادہ"
وہ لڑتے نہیں ہیں کبھی با ارادہ
اِسے یہ، نہ وہ اُس کو گردانتی ہے
مگر لوگ کہتے ہیں سب شانتی ہے

کبھی دیر سے گھر میں آنے پہ جھگڑا
کبھی پینگنوں کے پکانے پہ جھگڑا
کبھی اتنا تھوڑا کمانے پہ جھگڑا
کبھی بے سرے گیت گانے پہ جھگڑا
غزل پر، کبھی ہے فسانے پہ جھگڑا
یونہی بے سبب جی جلانے پہ جھگڑا
وہ "مردان" کا ہے یہ "پانی پتی" ہے
مگر لوگ کہتے ہیں، سب شانتی ہے

یہ پوچھا کسی نے ہے کب سے لڑائی
وہ بولے نہیں کوئی اب سے لڑائی
لڑیں جب سے آنکھیں ہے تب سے لڑائی
ہوئی جب سے شادی ہے سب سے لڑائی
عجم سے لڑائی، عرب سے لڑائی
ہے لوٹے سے چمچے سے ٹب سے لڑائی
یہ چلّاتے ہیں اور وہ ڈانٹتی ہے
مگر لوگ کہتے ہیں سب، شانتی ہے

چلے کیسے اب زندگانی کی لاری
پھنسی اِن کے انجن کی ہے ہر گراری
نہ رکھتے ہیں آپس کی کچھ پردہ داری
ہر اِک رازداں ہے، یہ ہے رازداری
انہیں کاٹے نااتفاقی کی آری
ہیں دونوں ہی صید اور دونوں شکاری
سرہانے پہ یہ ہیں تو وہ پائنتی ہے
مگر لوگ کہتے ہیں سب شانتی ہے

دلارے یہ گھر کے تو وہ ہیں دلاری
یہ ابا کے پیارے وہ اماں کی پیاری
نبھاتے ہیں آپس کی یوں رشتہ داری
مہینے میں ملتے ہیں دو چار باری
نتیجہ تھا یہ بعد رائے شماری
نہ یہ بازی ہارے نہ وہ بازی ہاری
وہ للکارتا ہے، یہ پھنکارتی ہے
مگر لوگ کہتے ہیں سب شانتی ہے

تلاشِ گمشدہ

عرفان قادر

''بشیراں کی تلاشِ گمشدہ میں''
ذلیل و خوار کتنا ہو گیا ہوں

ہوئی جس روز سے ہے گم بشیراں
پھرا کرتا ہوں مانندِ فقیراں
کبھی بھاٹی، کبھی مستی، لوہاری
کیا کرتا ہوں ہر جا مغز ماری

یہ دولت اور یہ شہرت بھی لے لو
بھلے تم چھین لو میری جوانی
مگر لوٹا دو تم مجھ کو بشیراں

جو گزرا قافلہ ہائے وزیراں
کروزر اور پاجیرو ہے جس میں
کہیں اُن میں نہ بیٹھی ہو بشیراں
کہیں اُن میں نہ وہ بیٹھی ہوئی ہو
یہی جب سوچ کر آگے بڑھا مَیں
تو فوراً اک پُلس والے نے روکا
ہٹو بابا جی، جاتے ہو کدھر کو

''سرِ شام آ کے مُرغِ نغمہ پیرا
کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا''
بڑی تھی سوز ناک آواز اُس کی
مرا دل بھی یکایک یہ پکارا
بشیراں! تُو کہاں ہے؟ تُو کہاں ہے!

''چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی، جاگا''
تو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا
کہیں اس میں بشیراں تو نہیں ہے

سٹیشن پر بھی اک دن میں گیا تھا
جو اک خاتون گوری بُرقعہ والی
کہیں اس میں بشیراں نہ چھپی ہو
ذرا پیچھا کیا جو اُس کا میں نے
تو کھائے میں نے جوتے اور گالی

کئی دن سے نہیں دفتر گیا میں
مجھے اب یاد آتے ہیں وہ سارے
''مرا دفتر، مری مثلیں، مری میز''
مرے گھر میں یونہی پھیلے ہوئے ہیں
مرے جُوتے مرے برتن وغیرہ
ہوا ہے صبر کا پیمانہ لبریز

تو اب یہ فیصلہ میں نے کیا ہے
اگر مِلتی نہیں کل تک بشیراں
میں اپنے شہر واپس لوٹ جاؤں
یہ کہتی ہے مجھے موقع شناسی
کہ رکھ لوں اب میں کوئی اور ماسی

احمد علوی

ایک شاعر نے جج کو دی عرضی
اِک سپاہی نے مجھ کو لوٹا ہے
چھین لی پینٹ اور گھڑی میری
دیکھئے جسم میرا ننگا ہے

جج یہ بولا کہ جسم پر تیرے
دیکھتا ہوں کہ ایک کچھا ہے
صرف اِس بات سے یہ ثابت ہے
تیرا دعوٰی غلط ہے، جھوٹا ہے

کر رہا ہے پلس کو تو بدنام
کب پلس نے کیا اُدھورا کام

ویر رس کے کوی

احمد علوی

چین کی حرکتوں پہ یہ خاموش
چین پر کب چلے ہیں شبد کے بان
ویر رس کے تمام کویوں کا
ایک موضوع صرف پاکستان

ختم لاہور کو یہ کر دیں گے
ایسے شبدوں کے تیر پھینکیں گے
آگ اگلتی ہوئی کویتائیں
ویر رس کے یہ ویر پھینکیں گے

ویر رس کے سبھی کوی مل کر
پاک کا روز دھنیہ واد کریں
پاک کے دم سے ہے وجود ان کا
بس محمد علیؒ کو یاد کریں

ایک ساتھی ہے ان کا دنیا میں
صرف اور صرف صرف پاکستان
ویر رس کے تمام کویوں کو
ملتی ہے صرف اسی سے تو پہچان

اپنی فوجوں کو اب بلا واپس
پاک حملہ اگر کرے اس بار
ویر رس کے تمام کویوں کو
پاک بارڈر پہ بھیج دے سرکار

ویر رس کے کوی لگائیں گے
جا کے لاہور میں ترنگے کو
پاک کی فوج سے لڑیں گے وہ
جھیل سکتے نہیں جو دنگے کو

ڈھونڈنے پر کسی بھی نقشے میں
کیا ملے گا ذرا سا پاکستان
ایسا کر دیں گے ویر رس کے کوی
اس زمیں پر کہیں تھا پاکستان

ان کو کم آنکتی ہے یہ دنیا
ویر رس کے کوی کی اک ہنکار
پاک کی کوئی حیثیت ہی نہیں
توڑ سکتی ہے چین کی دیوار

شہادت گاہِ دعوت

وہ جو ڈونگا سامنے تھا دھرا، لبالب بھرا، اُسے بھول جا
کوئی شخص تجھ سے بھی تیز تھا، اُسے لے اُڑا، اُسے بھول جا

وہ جو موٹے مرغ کی ٹانگ تھی، کسی اور پیٹ میں جا پڑی
اُسے یاد کرنے کا اب نہیں کوئی فائدہ، اُسے بھول جا

تجھے مل گئی ہیں جو ہڈیاں، بس اُنہیں سے کھیل کبڈیاں
جو ملا ہے بس اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا، اُسے بھول جا

تری دسترس میں نہ قورمہ، نہ کبابِ سیخ، نہ کوفتہ
ترے سامنے جو سلاد ہے، اُسے کھائے جا، اُسے بھول جا

یہ ہو دعوتوں میں ترا چلن کہ تری نگاہ میں ہو چکن
وہ بھی کاہلی کے سبب اگر نہ جھپٹ سکا، اُسے بھول جا

نہ پڈنگ ہوئی تجھے دستیاب، ہے کھیر تیرے لئے تو خواب
سنی ہے جو فیرنی قاب میں یہی چاٹ جا، اُسے بھول جا

ترے میزبان نے بھی اگر، تری بے بسی پہ نہ کی نظر
ارے وہ تو چھوٹی سی بات تھی، تو نہ دل پہ لا، اُسے بھول جا

ارے میم شین بھی تھا وہیں، اسے بھی تو مال ملا نہیں
یہ بھی غمزدہ، تو بھی غمزدہ، ارے جو ہوا، اُسے بھول جا

م ۔ ش ۔ عالم

شوکت جمال

میں یہاں پردیس میں ہوں اور تم سسرال میں
بھیج کر مجھ کو اِدھر بیٹھی ہو تم چکوال میں
کھا رہی ہو مرغیاں، اور مست ہوں میں دال میں
جی نہیں لگتا مرا اس جان کے جنجال میں

حسرتیں ہی حسرتیں ہیں اس دلِ پامال میں
جانِ من تم ہو کہاں الجھا کے مجھ کو جال میں

صبحدم کھاتا ہوں میں چٹنی سے سوکھی روٹیاں
ہیں میسّر تم کو تازہ نان، تکّے بوٹیاں
عیش کرتی ہیں وطن میں رہ گئیں جو ووٹیاں
مال کھا کھا کر ہمارا، ہوگئی ہیں موٹیاں

روئی جیسے بھر رہا ہو کوئی اُن کی کھال میں
جانِ من تم ہو کہاں الجھا کے مجھ کو جال میں

جو گزرتی ہیں یہاں، تم کو سنا سکتا نہیں
ضعف ہے اِتنا کہ دست و پا ہلا سکتا نہیں
کس قدر دبلا گیا ہوں میں بتا سکتا نہیں
ڈھونڈنے نکلوں اگر خود کو تو پا سکتا نہیں

کیا سے کیا میں ہوگیا ہوں ڈیڑھ دو ہی سال میں
جانِ من تم ہو کہاں الجھا کے مجھ کو جال میں

کام اتنا ہے کہ تھک کر چور ہوجاتا ہوں میں
روز و شب افسر کی اپنے، جھڑکیاں کھاتا ہوں میں
رات آدھی بیت جاتی ہے تو گھر آتا ہوں میں
ہاں، مگر سونے سے پہلے زیرِ لب گاتا ہوں میں

اک یہی مصرع مگر دھیمے سُروں میں، تال میں
جانِ من تم ہو کہاں الجھا کے مجھ کو جال میں

جوابِ شکوہ

خط تمہارا مل گیا ہے اور اب سن لو جواب
مفت میں جل بھن رہے ہو، بن رہے ہو تم کباب
جھانک کر اپنا گریباں بھی ذرا دیکھو جناب
تم نے اپنے راستے کا خود کیا تھا انتخاب

دن نہ یہ تم دیکھتے، رہتے اگر تم کھال میں
وہ خدا کی ذات رکھے جس کو جیسے حال میں

یاد ہے بھیجا تھا تم نے اک لفافہ عطر بیز
کھول کر دیکھا تو تھی فہرستِ سامانِ جہیز
ریڈیو ٹی وی وغیرہ سے ہمیں کب تھا گریز
گلف کے ویزے نے کی لیکن ہماری نبض تیز

تم نے ڈالا تھا مرے ابّو کو کس جنجال میں
وہ خدا کی ذات رکھے جس کو جیسے حال میں

چین سے میکے میں تھی، کیا لطف اُس راحت میں تھا
چولہا چکّی جھاڑو برتن کب مری فطرت میں تھا
میری شادی کے لئے ہر شخص بس عجلت میں تھا
ساس نندوں کو بھگتنا ہی مری قسمت میں تھا

جی رہوں میں نہ جانے کیسے اس بھونچال میں
وہ خدا کی ذات رکھے جس کو جیسے حال میں

ماں تمہاری پوچھتی رہتی ہیں، کب آئے گا لال
باپ اور بہنوں کی حالت پر بھی ہوتا ہے ملال
اور میں قسمت کی ماری کیا بتاؤں دل کا حال
لوٹ آنے کا مگر ہرگز نہ ہو تم کو خیال

بھول جاتے ہیں یہ سارے غم، وہاں کے مال میں
وہ خدا کی ذات رکھے جس کو جیسے حال میں

شوکت جمال

پی سی

ڈاکٹر عابد معز

شام کے وقت جب میں دفتر سے گھر پہنچا تو بیگم منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ میں نے دل میں 'اللہ خیر کرے!' کہا اور سوچا کہ خاموش رہوں۔ لیکن خیال آیا کہ میرے کچھ نہ پوچھنے پر بیگم مزید ناراض ہوسکتی ہیں۔ وہ سمجھیں گی کہ مجھے ان کی ''پرواہ'' نہیں ہے۔ اسی لیے جی کڑا کر کے دریافت کیا ''خیریت تو ہے، آپ کی طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے۔''

بیگم نے جو جواب دیا، اس سے فوراً پتا چل گیا کہ ''ناسازیِ طبیعت'' کی وجہ کیا ہے ''آج مہارانی ہمارے گھر تشریف لائی تھیں۔''

محلّہ کی نکڑ کی کوٹھی میں رہنے والی خاتون میری بیگم کو سخت ناپسند ہیں۔ بیگم کے خیال میں وہ مغرور اور نک چڑھی ہیں۔ اپنے آپ کو ''بہت کچھ'' سمجھتی ہیں جبکہ وہ ''کچھ بھی'' نہیں ہیں۔ وہ دوسروں بشمول اپنے مجازی خدا کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ سسرال والوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اور ملازمین کو ناکوں چنے چبواتی ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ اپنوں پر حکم چلاتی ہیں اور غیروں پر مختلف طریقوں سے رعب ڈالنے کی فکر میں اپنے وزن کو قابو میں رکھا ہے۔ یہ خفیہ اطلاعات کوٹھی میں کام کرنے والوں نے بیگم کو فراہم کی تھیں۔ ان خوبیوں کے سبب بیگم نے انھیں ''مہارانی'' کا خطاب دے رکھا تھا۔

میں نے بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی ''آپ ان سے خواہ مخواہ ہی بدگمان رہتی ہیں۔ دیکھئے کس سادگی سے وہ یہاں چلی آئیں۔''

جواب ملا ''سادگی کے ساتھ نہیں آئی تھیں۔ اپنے ساتھ سی ڈی لائی تھیں۔ پوچھ رہی تھیں کہ کیا ہمارے پاس پی سی ہے؟ پی سی یعنی پرسنل کمپیوٹر۔۔۔''

بیگم نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا ''جی میں جانتا ہوں۔''

بیگم نے اپنا بیان جاری رکھا ''وہ بتا رہی تھیں کہ ان کا سسٹم ڈاؤن ہے۔ صبح سے ان کے گھر میں زندگی جام ہے۔ فریج، ٹی وی، فون، انٹرکام، اے سی، گیزر، مکسر، مائیکرواُوون، گھڑی، الارم، غرض گھر کی ہر شے پی سی سے مربوط ہے۔ سی ڈی لے کر آئی تھیں کہ ہمارے پی سی میں ڈال کر maintenance والوں کو آن لائن اطلاع کرسکیں۔''

''پھر کیا آپ نے ان کی مدد کی؟''

اتنا پوچھنا تھا کہ بیگم پھٹ پڑیں ''مدد کہاں سے کرتی؟ پی سی ہے کہاں؟ شرمندہ ہونا پڑا۔ شادی کے وقت نگوڑا پی سی عام نہ تھا، ورنہ جہیز میں لے آتی۔ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ پی سی خریدیں گے لیکن جناب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مہارانی تعجب کا اظہار کر رہی تھیں کہ ہم لوگ پی سی کے بغیر کیسے جی رہے ہیں۔''

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ آفریقہ میں کئی لوگ آج بھی بجلی کے بغیر رہتے ہیں۔ کیا بجلی کے بغیر ان کا دل دھڑکنا بند کر دیتا ہے؟'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تو پھر گھر گرہستی چھوڑ کر دو ایک کپڑوں سے جنگل کی راہ کیوں نہیں لیتے۔ ہر بات میں آپ کے سوچنے کا انداز نرالا ہے۔'' بیگم نے چڑ کر کہا اور پھر اپنا فیصلہ سنایا ''ہم آج ہی پی سی خریدیں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ پڑوسیوں کی شہ پر ہمیں ایک مہنگی شے خریدنے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

بیگم نے میری بات رد کرتے ہوئے کہا ''پی سی کو آئے پندرہ بیس برس کا عرصہ ہو چکا ہے اور پی سی کی اولاد لیپ ٹاپ کو لوگ گلے میں لٹکائے پھر رہے ہیں۔ ہم اب خرید رہے ہیں تو یہ جلد بازی ہے؟''

میں نے بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی ''دیکھئے پی سی کوئی کھلونا نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے خرید لیں۔ یہ بتایئے کہ پی سی ہمارے کیا کام آئے گا؟''

''پی سی بہت کام کی چیز ہے۔ مہارانی کے گھر کا حال دیکھئے۔۔۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بجائے پی سی سانس لیتا ہے۔ پی سی کا ہی دل دھڑکتا ہے اور وہ پی سی کی طرح سوچتی ہیں۔۔۔''

میں نے بیگم کی بات کاٹی ''پی سی خرید کر گویا آپ بھی مہارانی بننا چاہتی ہیں۔''

''جی نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور اگر آپ چاہیں گے بھی تو میں مہارانی نہیں بن سکتی۔ آپ کے فائدے کے لیے میں پی سی کی خوبیاں گنا رہی تھی۔ پی سی سے مجھے روزمرہ کے کاموں میں مدد ملے گی۔ گھر کا بجٹ پی سی کے مشوروں سے تیار ہوگا۔ مینو تیار کرنے اور دسترخوان سجانے میں پی سی معاون ہوگا۔ پی سی میں پکوان کی ترکیبیں اور کام کی باتیں جمع کروں گی۔ پی سی کے ذریعہ

میں گوشت اور ترکاری کے بھاؤ معلوم کروں گی۔۔۔''

میں نے پھر بیگم کی بات کاٹی ''گویا پی سی کا استعمال کچن میں ہوتا ہے۔''

وہ جواباً پی سی کے دوسرے فوائد گنوانے لگیں ''جلئے مت پی سی آپ اور بچوں کے بھی بہت کام آئے گا۔ آپ اپنی سروس اور آمدنی کا حساب کتاب پی سی میں رکھیے۔ دوستوں کے پتے اور فون نمبر پی سی میں اکٹھا کیجیے۔ انہیں خطوط لکھئے۔ پی سی کی مدد سے مضامین لکھئے اور شاعری بھی کیجیے۔ جب آپ اپنی تخلیقات پی سی پر لکھ کر رسالوں کو بھیجیں گے تو مدیر آپ سے کبھی یہ نہ کہیں گے کہ براہ کرم مضامین خوش خط لکھا کیجیے۔ استاد بن کر پی سی آپ کی تخلیقات کی تصحیح بھی کر دے گا۔ کتابیں چھپوانے میں پی سی کام آئے گا۔ کاتب کی ناز برداری نہیں کرنی پڑے گی۔ پی سی پر آپ اخبار پڑھ سکتے ہیں۔ خبریں سن اور دیکھ سکتے ہیں۔ موسمی پیش قیاسی حاصل کر سکتے ہیں۔ کرکٹ کا اسکور دریافت کر سکتے ہیں۔ مختلف مسائل پر اس سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ پی سی آپ کا دل بھی بہلائے گا۔ اس کی مدد سے آپ موسیقی سیکھ سکتے ہیں۔ فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ پی سی کے ذریعہ نئے دوست بنا سکتے ہیں اور ان سے گھر بیٹھے بات کر سکتے ہیں۔۔۔''

بیگم سانس لینے کے لیے رکیں تو میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ ''آپ مارکیٹنگ بہت اچھی کر لیتی ہیں۔ چلیے ہم پی سی خرید لیتے ہیں۔''

بیگم بولنے کے موڈ میں جب آتی ہیں تو بڑی مشکل سے خاموش ہوتی ہیں۔ خوش ہو کر کہنے لگیں ''آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ بچوں کے لیے پی سی معلومات کا خزانہ ہے۔ بچوں کی تربیت میں پی سی اہم رول ادا کرتا ہے۔ پی سی بچوں کو ٹیوشن دے گا۔ پی سی کے رہتے ہوئے ہمیں بچوں کو پڑھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ ہوم ورک کرنے میں بچوں کی مدد کرے گا اور ان کا امتحان بھی لے گا۔ پی سی میں بچوں کے لیے کئی کھیل ہیں۔ بچے گھر میں کھیلتے بیٹھے رہیں گے۔ ان کے باہر گھومنے پھرنے پر پی سی روک لگا دے گا۔۔۔''

میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا ''اب بس بھی کیجیے۔ ہم اس ماڈرن الہ دین کے چراغ کو خرید ہی رہے ہیں۔ دیکھ لیں گے وہ اپنے آقاؤں کی کتنی خدمت کرتا ہے۔ فی الحال زور کی بھوک لگی ہے۔ کچھ کیجیے۔''

بیگم کچن کا رخ کرتے ہوئے بولیں ''مجھے قوی امید ہے کہ پی سی آپ کو مایوس نہیں کرے گا، وہ آپ کو خوش رکھے گا۔''

پی سی موجودہ دور کا الیکٹرانک ہر فن مولا، خریدنے مارکٹ گئے تو پتا چلا کہ پی سی اکیلا خود سے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کنبہ پرور ہے اور اس کا ایک مکمل خاندان ہے۔ پی سی کا خاندان کی بورڈ، مانیٹر، پرنٹر، اسپیکر، موڈیم، جوئے اسٹک، ساؤنڈ کارڈ، ویڈیو کارڈ اور چند دوسری اشیا پر مشتمل ہے۔ صدرِ خاندان پراسیسر ہے۔ دن بہ دن پی سی فیملی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ خاندان اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ پرانے لوگوں کو اس فیملی کے نئے ممبروں سے شناسائی مشکل معلوم ہوتی ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ پی سی ایک پالتو چوہا (ماؤس) بھی رکھتا ہے۔ یہ چوہا پی سی کی اردلی میں رہتا ہے اور لوگوں کے بہت کام آتا ہے۔ پی سی کے ساتھ چوہے کا ہونا نہ صرف ضروری ہے بلکہ وہ چوہے کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ پی سی کے ساتھ دریچے (ونڈوز) بھی خریدنا پڑا۔ ان دریچوں کی مدد سے پی سی باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ قصہ مختصر، زرِ کثیر صرف کر کے ہم پی سی اور اس کے لوازمات اپنے گھر لے آئے۔ بیگم بہت خوش ہوئیں جیسے کوئی میکے سے ان کا اپنا آیا ہے۔

دُکاندار نے ہدایت دی کہ پی سی بڑا نازک مزاج واقع ہوا ہے اور اس کا خاص خیال رکھا جائے۔ گرمی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ کھلی اور ہوادار جگہ میں اس کو رکھنا چاہیے۔ اگر خاطر خواہ خیال نہ رکھا گیا تو وہ بیمار پڑ سکتا ہے۔ اس پر وائرس حملہ آور ہوتے ہیں اور اس میں کیڑے (بگس) پیدا ہو سکتے ہیں۔ پی سی کے ساتھ نباہ کی ہدایتوں کے مطابق ہم نے گھر کے ایک وسیع اور کشادہ ہال میں پی سی اور اس کے خاندان کی رہائش کا انتظام کیا۔ پی سی فیملی کے اراکین کو ان کی مناسب جگہ رکھنے اور ان کے لیے درکار

فرنیچر بھی خریدا۔ ساتھ میں خود اپنے لیے ایک مخصوص کرسی بھی لینی پڑی جس پر بیٹھ کر ہم پی سی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے کام لے سکیں۔ پی سی کے پالتو چوہے کا بھی ہمیں خیال کرنا پڑا اور اس کے لیے ایک آرام دہ پیڈ کا اہتمام ہوا۔ نرم گدی پر چوہا خوب تھر کنے لگا۔

بیگم اور بچے پی سی اور اس کے خاندان کی ناز برداری کرنے میں بہت خوش تھے اور میں اس تجسس میں تھا کہ دیکھیں وہ ہماری کیا خدمت کرتا ہے۔ پتا چلا کہ پی سی سے بات کرنے اور اس پر حکم چلانے کے لیے پی سی کی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ ہم اس جناتی زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے قابل نہ تھے۔ پی سی کی زبان کے ماہرین نے ہمارا یہ مسئلہ یوں حل کر دیا ہے کہ پی سی کے خاندان میں مترجم کو بھی شامل کر دیا جو ہماری باتیں اور احکامات پی سی تک پہنچاتا ہے اور پی سی کے معروضات اور گذارشات کو ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ ماہرین اس مترجم کو اپنی مجبوریوں کے تحت سافٹ ویر کہتے ہیں۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو بس پی سی پر حکم چلانا ہے۔

حکم چلانے میں ہم غلطی کریں تو پی سی فوراً ٹوکتا ہے ''غلط حکم'' (بیڈ کمانڈ) اور صحیح حکم کا منتظر رہتا ہے۔ جب ہم اسے مستقل غلط حکم دیتے ہیں تو وہ ناراض ہو کر انتباہ دیتا ہے۔ ''آپ مستقل غلط احکامات جاری کر رہے ہیں۔ میں کبھی بھی بند ہو سکتا ہوں۔'' اور پھر خاموشی سے اپنے خول میں بند ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ مشورہ بھی دیتا ہے۔ ''آپ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔ سوچ سمجھ کر مجھ پر حکم چلایئے۔ اگر میں آپ کی سمجھ سے باہر ہوں تو براہ کرم مدد طلب کریں یا ماہرین سے رجوع ہوں۔'' اور اسکرین پر ماہرین کے نام، پتے اور فون نمبر درج ہو جاتے جن سے مشورہ کر کے ہم پی سی کو ٹھیک طرح سے چلانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

ہم نے پی سی کو ہر دم کام کے لیے تیار پایا۔ انسانوں کے برخلاف اس نے کبھی آج کے کام کو کل پر نہیں ٹالا۔ وہ ہر کام چند سیکنڈ میں کر دیتا ہے۔ پی سی اس قدر معاون و مددگار ہے کہ وہ خود بتاتا جائے گا کہ اس سے کس طرح کام لیا جائے۔ پی سی کی یہ ادا مجھے بے حد پسند آئی لیکن بعض مرتبہ محسوس ہوا جیسے پی سی ہمارا محکوم نہیں ہے بلکہ بہت شاطر اور چالاک آقا ہے اور ہم اس کے غلام ہیں۔ ہم اس کے سامنے گاؤدی اور بے وقوف بنے بیٹھے ہیں اور وہ حسب منشا ہم سے کام کروا رہا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے کے لیے حکم دیا جائے تو پی سی صاف مکر جائے گا۔ ''ایسا ممکن نہیں ہے۔'' تب آپ چوہے کی مدد سے پی سی کے ہر دریچے میں جھانک کر اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے رہیں لیکن مجال ہے کہ پی سی خود کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر دے!

کتابیں پڑھ کر، لوگوں سے پوچھتے ہوئے اور خود پی سی کی ہیلپ اور ہدایات سے میں، بیگم اور بچے پی سی استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔ خوب وقت گزرنے لگا۔ میں نے جب اس نئی تفریح کا ذکر اپنے ایک دوست سے کیا تو انہوں نے مشورہ دیا ''میاں تم اپنے پی سی کو مختلف دوسرے پی سیوں سے جوڑ دو۔ بہت لطف آئے گا۔ تمھارے قبضے میں ایک نہیں کئی الہ دین کے چراغ ہوں گے۔''

ہم نے دوست کا مشورہ مان کر اپنے پی سی کو دنیا جہاں کے ''پی سیوں'' سے مربوط کیا۔ ماہرین نے اس عمل کو انٹرنیٹ کا نام دے رکھا ہے۔ مختلف مقامات کے پی سیوں سے جڑتے ہی ہمارا پی سی بہت تیز اور ہوشیار ہو گیا۔ اس کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ بھی ہوا۔ ہم نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر اپنے پی سی کو حکم دیا کہ امریکہ کی تاریخ بتاؤ۔ وہ دوسرے کئی کمپیوٹرس کی مدد سے ریڈ انڈین کے زمانے سے امریکہ کی تاریخ بتانے لگا۔ کبھی پوچھا کہ اطالوی کاپوچینی کافی کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤ اور پھر اسے تیار کرنے کی ترکیب بتاؤ۔ اس مرتبہ بھی ہمارے پی سی کی مدد کے لیے دوسرے کمپیوٹرز آگے آ گئے۔ ہم نے کبھی غالب کے کلام کے ساتھ شیکسپیر کی رومیو جولیٹ کی فرمائش کی تو کبھی کرکٹ میں سب سے زیادہ رن بنانے والے کھلاڑی کا نام پوچھا، کبھی ڈالر کی قیمت پوچھی تو کبھی پونڈ کا مزاج دریافت کیا، کبھی سونے کا بھاؤ معلوم کیا تو کبھی تیل کی قیمت پوچھی، کبھی جرمن سکھانے کے لیے کہا تو کبھی فرنچ میں ترجمہ کی درخواست کی، کبھی انگولا کے صدر کا نام

بتانے کے لیے کہا تو کبھی تھائی لینڈ کے کسی صوبے کے گورنر کی عمر دریافت کی۔ غرض ہر کام کے لیے پی سی تیار ہے اور چند منٹوں بلکہ سکنڈوں میں جواب حاضر ہے۔

علم و آگہی کی اس وسعت کے باوجود انکساری اور فرمانبرداری کی انتہاء ہے کہ بٹن دبایا اور پی سی خدمت کے لیے حاضر ہے! ہم پی سی جیسے خادم کو پا کر فخر سے پھولے نہ سمائے۔ موقع ملتے ہی اس کی سنگت میں وقت گزارنا ہمیں اچھا محسوس ہونے لگا۔ بیگم نے کہیں آنا جانا بند کر دیا کہ انہیں پی سی پر کام کرنا ہے۔ سہیلیوں کو فون کر کے رعب جماتیں ''ابھی پی سی نے بتایا کہ دنیا کے اسی فی صد ذرائع صرف بیس فی صد ترقی یافتہ ملکوں کے پاس ہیں، جبکہ بقیہ اسی فی صد لوگوں کا گزارہ صرف بیس فی صد ذرائع پر ہوتا ہے۔ کبھی تم نے سوچا، ایسا کیوں ہے؟''

پی سی کی آمد سے سب سے زیادہ بچے خوش ہوئے۔ باہر کھیلنے کودنے کے لیے جانے کے بجائے گھر میں پی سی کے اطراف منڈلانے لگے۔ مشکل سے انھیں پی سی سے الگ کر کے باہر بھیجنا پڑتا۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بچے انجینیر اور ڈاکٹر بننے کے بجائے پی سی کے ماہر بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ پی سی کے تئیں ہماری محبت اور جنون کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ترقی کے زینے بہت تیزی سے طے کر کے پی سی کے دست نگر ہو جائیں گے۔

پی سی کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ہر صبح اس سے مشاورت کر کے سارے دن کا پروگرام بنانے لگا۔ ایک صبح میں نے وقت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس وقت صبح کے نو بج رہے ہیں۔ گرینچ کا معیاری وقت ساڑھے تین صبح ہے۔ ریاض شہر میں چھ بج کر تیس منٹ ہو رہے ہیں۔ جرمنی میں گھڑی صبح کے ساڑھے چار بجا رہی ہے۔ قاہرہ میں صبح کے ساڑھے پانچ، کراچی میں ساڑھے آٹھ اور ڈھاکہ میں ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جاپان، چین اور فلپائن میں اس وقت دوپہر ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں سہ پہر ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں رات ہے۔

اس خیال سے کہ مختلف مقامات کا وقت بتاتے ہوئے کہیں پی سی میری ''اوقات'' بتانے پر نہ اتر آئے، میں نے آج کی تاریخ

ہیرو کا نیا تصور

میرے ایک دوست کا (جو امپورٹ کنٹرول میں ایک معمولی کلرک ہے) ہیرو اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہے جو۔ کئی بار اس کے ساتھ شام کو پر رونق صدر میں گزرتے ہوئے اور منور دکانوں میں حسین چہروں کو تاکتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں سامنے بشرٹ میں ایک گنجے بیلچ نما انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ''یہ چوہدری عبدالکریم ہے، ہمارا سپرنٹنڈنٹ، ساڑھے آٹھ سو تنخواہ پاتا ہے۔'' میرا دوست یہ کہتے وقت ایک بچے کی طرح خوش اور مغرور ہوتا ہے جیسے کہ اس نے مجھے دنیا کا ایک آٹھواں عجوبہ دکھا دیا ہو۔ ایک عجوبہ، جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ایجاد کیا ہو۔ چوہدری عبدالکریم میرے دوست کے لیے اولمپیا کا دیوتا ہے۔ اُس کے نزدیک چوہدری عبدالکریم انسانی ترقی کی ایسی معراج پر پہنچ چکا ہے جہاں اُس جیسے شخص کبھی پہنچنے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتے۔ عموماً ہمارے ہیرو ایسے شخص ہوتے ہیں جو کچھ بن چکے ہیں، جو ہم بننا چاہتے تھے، مگر جانتے ہیں کہ کبھی بھی نہ بن سکیں گے۔

چاکیواڑہ میں وصال از محمد خالد اختر

پوچھی۔ پی سی تاریخ اور دن بتانے کے بعد پچھلے دو سو سال کی اس دن سے وابستہ تاریخ بھی پیش کرنے لگا۔ آج کے دن ۱۹۴۰ء میں برطانیہ اور روم نے فرانس پر حملہ کیا تھا۔ آج ہی کے دن ۱۷۹۹ء میں ریاست میسور کے فرماں روا ٹیپو سلطان کو شہید کیا گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے موسمی پیشن گوئی کے لیے کہا تو پی سی بتانے لگا ''مطلع صاف رہے گا اور دھوپ تیز رہے گی۔ درجۂ حرارت ۳۹ ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچ سکتا ہے۔ ایر کنڈیشنر کی ضرورت محسوس ہوگی۔'' اور پھر پی سی نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ محکمہ موسمیات کا بھروسہ نہیں، چھتری ساتھ رکھنا مفید ہوگا۔

پی سی نے ستاروں کی مناسبت سے آج کے دن کے لیے قسمت کا حال بھی سنایا ''رومانس کے لیے آج کا دن مناسب نہیں

ہے۔ سراہ پٹ جانے کا احتمال ہے۔ بیگم بھی آپ کی ٹوہ میں رہ سکتی ہیں۔ بزنس کے لیے آج کا دن اچھا ہے۔ شیرز مارکٹ میں پیسہ ڈالنا خوش قسمتی کے دروازے کھول سکتا ہے۔ لیکن احتیاط ضروری ہے۔ خوش بختی کے لیے آج کا رنگ نیلا ہے۔ نیلا شرٹ پہننا قسمت کو چمکا سکتا ہے۔ بیگم سے ملے بغیر گھر سے نکلنا اچھا شگون ثابت ہو سکتا ہے لیکن یاد رہے لوٹنے پر آپ کی خیریت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔۔۔''

اور پھر ستاروں کا حال سنانا چھوڑ کر پی سی وارننگ دینے لگا۔ ''جناب والا، کافی وقت ضائع کر لیا۔ رات کے بچے ہوئے کھانے کا ٹفن اٹھایئے اور دفتر کے لیے چل پڑیئے۔ تو تمیں کی بس، بس اب آتی ہی ہوگی۔ اس ماہ آپ چھ بار دیر سے دفتر جا چکے ہیں۔ باس کی ڈانٹ سن چکے ہیں۔ اب کیا میمو لینے اور تنخواہ کٹوانے کا ارادہ ہے؟''

پی سی کی وارننگ سن کر مجھے پسینہ چھوٹنے لگا اور میں اس الیکٹرانک جن سے پیچھا چھڑانے کے لیے ''کوِٹ''(quit) کا بٹن دبا کر بس اسٹاپ کی جانب دوڑ پڑا۔

اب ہمارے گھر میں مینو پی سی کے مشوروں پر تیار ہونے لگا۔ یہی نہیں بیگم نے بتایا کہ پکوان کی نگرانی بھی وہ خود کر رہا ہے۔ میں نے دوستوں پر رعب ڈالنے کی خاطر انہیں پی سی کے مشوروں پر بنا کھانا تناول کرنے کی دعوت دی۔ ایک دن جب سب جمع ہوئے تو میں نے احباب کے درمیان بیگم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''بیگم پی سی چلانے میں ماہر ہو گئی ہیں۔ وہ اس کی اعانت سے گھر کی عنانِ حکومت بہتر انداز میں سنبھالی ہوئی ہیں۔''

میری بات سن کر ایک دوست نے اپنے خیال کا اظہار کیا ''بیویاں کیسے کیسے اڑیل شوہروں کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلا لیتی ہیں۔ پھر پی سی کیا چیز ہے۔ اسے تو وہ انگلیوں پر نچا سکتی ہیں۔''

پی سی کے تیار کردہ پکوان کے خیال سے بھوک کچھ زیادہ ہی چمک اٹھی تھی۔ کھانے کی میز کو دیکھا تو اس پر ترکاریوں اور میووں کا قبضہ تھا۔ مرغ و ماہی کا کوسوں دور تک پتا نہ تھا۔ رحم طلب نظروں سے ہم سب نے بیگم کی جانب دیکھا۔ وہ فرمانے لگیں ''پی سی کہتا ہے کہ مرغن غذا سے ترکاری اور میوے بہتر ہیں۔ بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں وٹامنز کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہر دن ہمیں کم از کم پانچ قسم کی ترکاریاں اور میوے کھانا چاہیے۔''

پی سی کی شہ پر بنے روکھے سوکھے کھانوں کو حلق سے اتارنے کے لیے پانی مانگا تو میرے برابر بیٹھے دوست نے پانی کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا ''پی سی کا حکم ہے کہ کھانے کے دوران پانی نہیں پینا چاہیے۔ خاموشی سے پی سی کا تیار کردہ کھانا کھالو۔''

پی سی کو دعائیں دیتے ہوئے ترکاری اور پھل کو زہر مار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مہینے کی پہلی تاریخ پر بیگم نے اخراجات کا تخمینہ اور میں نے تنخواہ اور تمام الاونس کو پی سی کے سامنے رکھا۔ حساب کرنے کے کے بعد پی سی نے بتایا کہ آمدنی اور اخراجات میں فرق تقریباً میری ایک تنخواہ کے برابر ہے۔ یعنی ہمیں گھر چلانے کے لیے مزید ایک تنخواہ چاہیے۔ پی سی سے اس مسئلہ کا حل پوچھا گیا۔ اس نے مختلف تجاویز پیش کیں۔

پہلا حل تھا کہ خرچ کم کیا جائے۔ ہم نے پی سی کو بتایا کہ گرانی کے دور میں خرچ کم ہونا ناممکن ہے۔ کمی کے برخلاف اضافے کی قوی امید ہے۔ دوسرا حل تھا کہ پارٹ ٹائم جاب کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ موجودہ نوکری کرتے ہوئے بچوں کو پڑھانے اور ان سے بات کرنے کے لیے مشکل سے وقت ملتا ہے، پارٹ ٹائم نوکری کے لیے وقت کہاں سے لاؤں۔ میں نے پی سی سے کچھ وقت مستعار مانگا تو پی سی نے بتایا کہ اس کے پاس بھی وقت کی بے انتہا کمی ہے۔ تیسرا مشورہ تھا کہ اس مسئلہ کے مستقل حل کے لیے کوئی بڑا ہاتھ مارا جائے۔ ہم نے قیاس کیا کہ وہ لاٹری کا ٹکٹ خرید کر قسمت آزمانے کی صلاح دے گا لیکن پی سی نے بنک میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ پیش کیا اور بتایا کہ منصوبہ بہت شاندار اور فول پروف ہے۔ اسے ماہرین نے تیار کیا ہے۔ مشورہ سن کر بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ بگڑی حالت بہتر کرنے کے لیے ہم نے

بنک میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ رد کر دیا۔

بیگم نے پی سی سے رشوت کے تعلق سے پوچھا۔ اس نے رائے دی ''سکۂ رائج الوقت ہے۔ چھوٹے موٹے ملازم سے لے کر سربراہان حکومت تک اسے قبول کرتے ہیں۔ آمدنی بڑھانے کا یہ ایک معقول طریقہ ہے۔''

میں نے اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے پی سی سے کہا ''میں کرتا یہی ہوں۔''

پی سی نے بتایا کہ اس کے پاس ایک ایسا پروگرام بھی ہے جو شادی کے امیدواروں کو جیون ساتھی چننے کے لیے مشورہ دیتا ہے۔ لڑکا اور لڑکی کے درمیان نباہ کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے اور متوقع امیدواروں کو ان کی پسلی کا جوڑ بھی فراہم کرتا ہے۔ ہم نے اس پروگرام کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ میں اور بیگم نے سوال نامہ پر کر کے پی سی کے حوالے کیا اور پوچھا ''کیا ہم میں نباہ ہو سکے گا؟''

کچھ دیر گمبھیر خاموشی کے ساتھ پی سی سوچتا رہا اور پھر جواب دیا ''امیدواروں کی عادات و اطوار اور خیالات قطب شمالی اور قطب جنوبی کی طرح ہیں۔ نباہ ممکن نہیں ہے۔ دونوں آپس میں شادی سے سخت پرہیز کریں۔ اگر بدقسمتی سے شادی ہو بھی جائے تو چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔''

پی سی کا فیصلہ سن کر میں نے بیگم سے کہا ''داد دیجیے بیگم، پچھلے پندرہ برس سے نباہ کیے جا رہا ہوں۔''

بیگم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا ''اور میں جو صبر کیے جا رہی ہوں۔ اس کا بھی حساب کیجیے گا۔''

بچے گھنٹوں پی سی کے ساتھ کھیلتے رہنے لگے۔ مختلف سوالات کر کے ہمیں تنگ کرنے کے بجائے اسی سے ہر بات دریافت کر لیتے تھے۔ پی سی نے ہماری پول کھول دی تھی۔ مشکل الفاظ کے معنی معلوم کرنا، الفاظ کا جملوں میں استعمال، مختلف موضوعات پر مضامین لکھنا اور حساب کے سوالات حل کرنے سے لے کر وقت گزاری کے لیے تک بچے پی سی کا استعمال کرنے لگے۔

چند دنوں میں پی سی سب کی ضرورت بن گیا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی اس کو مصروف رکھتا۔ گھر میں ہر فرد اپنے لیے ایک الگ پی سی کی حاجت محسوس کرنے لگا۔ لیکن ہم ایک سے زیادہ پی سی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی اکلوتے پی سی پر سب کا گزارہ ہونے لگا۔

ایک صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی سب ہی نے پی سی پر یلغار کر دی۔ بیگم پی سی کی مدد سے ناشتہ تیار کرنا چاہتی تھیں۔ میں الیکشن کے تازہ نتائج جاننا چاہتا تھا۔ بڑا لڑکا گذشتہ رات پی سی کو لکھوائے مضمون کے پرنٹ کا طلب گار تھا۔ لڑکی کو انگلش گرامر کے جوابات مطلوب تھے اور چھوٹے لڑکے کو پی سی پر بنائی گئی ڈرائنگ حاصل کرنی تھی۔ ہم آپس میں لڑتے جھگڑتے پی سی کو مختلف مقامات سے دبانے لگے۔

تنگ آ کر اور کسی کی نہ سنتے ہوئے پی سی نے احتجاجی پیغام دیا ''آپ لوگوں کو مزدوروں سے کام لینے کا سلیقہ نہ پہلے آتا تھا اور نہ اب آتا ہے۔ ظلم سہتے سہتے آخر مزدور جاں بحق ہو جاتا ہے۔'' اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ہم مختلف بٹن دباتے ایک دوسرے کے چہرے تکتے رہے لیکن پی سی کے چہرے پر اندھیرا ہی رہا۔ میں نے بیگم سے کہا ''اب آپ سی ڈی لے جا کر مہارانی صاحبہ کے پی سی کی مدد لیجیے۔ ہمارا کام بن جائے گا اور انہیں معلوم بھی ہو جائے گا کہ آپ بھی پی سی رکھتی ہیں۔''

بیگم نے کچھ نہیں کہا لیکن غصہ اور بے بسی سے مجھے اور پی سی کو گھورنے لگیں۔

عابد معز صاحب کا تعلق حیدرآباد (بھارت) سے ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ اُردو ادب سے اِن کی محبت بہت پرانی ہے۔ طنز و مزاح اِن کا خصوصی میدان ہے۔ اُردو طنز و مزاح سے حوالے سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ ''شگوفہ'' کے علاوہ بہت سے ادبی و غیر ادبی جرائد میں اِن کے مزاحیہ مضامین تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ بہت نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔

مزاحیہ

محمد اشفاق ایاز

وائے حسرتِ عقد

چھٹی کا دن تھا۔ پھر بھلا سویرے کون اٹھے۔ میاں لچھن کی اکلوتی پیدوار باؤ کچھن کی گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ اس وقت تک اماں حضور گھر کی صفائی ستھرائی سے بھی فارغ ہو کر ایک ہمسائی کے ساتھ داخلی و خارجی دُکھ سُکھ، بشمول باہمی دلچسپی آس پاس پڑوسنوں کی سرگرمیوں جیسے امور پر تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

''اس کا مطلب ہے ابا گھر میں نہیں ہیں۔ ورنہ اماں کی یہ مجال کہ ہمسائی سے یوں کھل کھلا کر بات کریں۔''

باؤ کچھن کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ بے فکر ہو کر کمرے سے نکلے اور صحن سے ہوتے ہوئے غسلخانے کی طرف بڑھے۔ ہمسائی کی نظر باؤ جی پر پڑی تو بڑی رازداری سے بولیں ''کب تک اکیلے گھر کا کام کرتی رہو گی۔ کوئی بہو کیوں نہیں لے آتیں۔''

بیگم لچھن نے حسرت بھری نظروں سے اپنے سوکھی ٹانگوں والے شہزادے کی طرف دیکھا اور بولیں ''اسے کہیں نوکری ملے تو سہی۔ ہم نے کسی کی بیٹی کو بھوکا تو نہیں مارنا۔''

باؤ کچھن کے دل پر گفتگو کے پہلے حصے کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ غسلخانے کی بجائے باہر گلی میں نکل گئے۔ گلی میں قدم رکھتے ہی اُن پر حقیقیت کھلی کہ اب وہ گلی کی نالی پر بیٹھ کر فارغ ہونے کی عمر سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ فوراً اندر آئے۔ غسلخانے کا رخ کیا، جہاں اندر داخل ہونے سے پہلے شیطان سے پناہ مانگنے کی دعا پڑھی۔ شیطان پر اس دعا کا اثر ہوا یا نہیں لیکن ہمسائی کے الفاظ اُن کے دماغ کے ساتھ ایسے چپک گئے تھے۔

جیسے سفید کپڑوں پر مٹی کے داغ۔

غسلخانہ ایک ایسی جگہ ہے، جہاں ایک دو دوسری چیزوں کے ساتھ دماغ کی کھڑکیاں بھی کھل جاتی ہیں اور ایسے ایسے خیالات ومناظر ذہن کے پردے پر نمودار ہونے لگتے ہیں جو عام حالات میں دماغ پر لاکھ زور دینے کے باوجود پکڑائی نہیں دیتے۔ ابھی باؤ چھن فراغت کی نصف منزلیں ہی طے کر پائے تھے کہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پاجامہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اندر سے غسلخانے کا دروازہ پیٹنے لگے۔ ان کی اکلوتی اماں دوڑتی ہوئی آئی اور باہر سے بولی '' کیا ہوا کمبخت مارے؟''

''اماں دروازہ کھولو۔''

''چھٹے کی اولاد، یہ اندر سے بند ہے۔''

غسلخانے میں آتش فشاں پہاڑ کی طرح اچانک پھٹنے والے جذبات کی شدت نے باؤ چھن کے احساسات شرمندگی کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے ''کئے کرائے'' پر پانی بہائے اور ہاتھ دھوئے بغیر لاسٹک والا پاجامہ سنبھالتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف دوڑے، جیسے اپنا ادھورا کام وہاں جا کر مکمل کریں گے۔ اماں، باؤ چھن کی اس ہیجانی کیفیت پر کچھ بھی نہ بولیں۔ بولتیں بھی تو کیا ہو جاتا۔ ان کی ایک عمر اپنے ''سارے جگ توں سوہنے شوہر نامدار'' میاں چھن کے انوکھے اعمال و افعال کو برداشت کرتے گزری تھی۔ اب اپنی اکلوتی اولاد کی جولانی طبع کے تماشے دیکھ دیکھ کر سوائے اللہ سے دعا کرنے کے اور کیا کر سکتی تھیں۔

چند منٹ بعد ہی باؤ چھن اسی حالت میں کمرے سے باہر آئے۔ دونوں ہاتھوں سے پاجامے کو یوں پکڑ رکھا تھا جیسے ازار بند ٹوٹ گیا ہو اور ابھی نیچے گرا کہ گرا۔ لیکن اس میں تو لاسٹک تھا، پاجامہ نیچے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی اماں کے پاس آئے۔ اماں نے پہلی دفعہ باؤ چھن کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر رونق دیکھی تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں '' کیا ہوا میرے لال۔ خیریت تو ہے؟'' انہیں خوش دیکھ کر اماں کو تشویش لاحق ہوگئی ''پیسے نہ مانگنا۔ تمہارے ابا کو اس ماہ پنشن نہیں ملی۔ اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو کہو!''

''نہیں اماں کچھ نہیں۔ تمہاری بہو کا بندوبست ہو گیا ہے۔'' یہ سنتے ہیں اماں کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ انہیں یوں لگا جیسے باؤ چھن نے ان پر گرم پانی انڈیل دیا ہو۔ اپنی لاڈلی اولاد سے اس انکشاف کی بالکل توقع نہ تھی۔ ابھی وہ اس بارے کچھ پوچھنے ہی والی تھیں کہ انہیں بُو کا احساس ہوا'' کم بخت مارے دھوئے بغیر ہی غسلخانے سے باہر آ گئے ہو۔ پاجامہ بھی خراب کر دیا ہوگا۔''

باؤ چھن کو کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا۔ فوراً اٹھ کر غسلخانے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنا ادھورا مشن مکمل کرنے کے بعد پاجامہ کے متاثرہ حصے کو بھی دھویا اور باہر آ گئے۔

باؤ چھن کی اِس اچانک طوفانی ہلچل کے پیچھے ایک خوبصورت آئیڈیا تھا۔ اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو میاں چھن فیملی کے مالی حالات پر مدتوں سے جمی کائی دِنوں میں دور ہو سکتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس گلی کے آخری میں میڈم نزہت کا گھر تھا۔ وہ ایک سکول میں ہیڈ مسٹریس تھی۔ چند سال پہلے اس کا شوہر انتقال کر گیا جو خود کافی مال و دولت چھوڑ کر گیا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے اب میڈم نزہت اس گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ تقریباً ایک سال قبل وہ خود بھی ساٹھ سال عمر پوری ہونے پر ریٹائر ہوگئیں اور انہیں پینشن وغیرہ کی مد میں لاکھوں روپے ملے تھے۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور مالی آسودگی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ غسلخانے میں جس خیال نے باؤ چھن کے ہوش اڑا دئے تھے وہ یہ تھا کہ اگر میڈم نزہت اس کا جیون ساتھی بننے پر راضی ہو جائیں تو دونوں کی بقیہ زندگی خوب نبھ سکتی ہے۔ آخر میڈم نزہت نے اِتنا پیسہ کہاں خرچ کرنا ہے۔ میڈم نزہت باؤ چھن سے اڑھائی گنا زیادہ عمر کی ہیں تو کیا ہوا۔ بس میڈم نزہت کی ہاں چاہئے۔ باؤ چھن کو پوری امید تھی کہ اگر اس نے ایک دفعہ میڈم جی کو حال دل سنایا اور ان کے بڑھاپے کا سہارا بننے کی نوید سنائی تو وہ مان ہی جائیں گی۔ اماں کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی اور باؤ چھن کے بارے میں محلے والوں کے طعنے بھی اپنی موت مر جائیں گے۔

باؤ چھن بغیر ناشتہ کئے گھر سے نکلے۔ پیچھے اماں آوازیں ہی

دیتی رہ گئی۔ ''بیٹا میں نے تمہارے لئے مولی والے پراٹھے خاص طور پر بنائے ہیں۔'' پر اب تو وہ میکڈونلڈ کے برگر کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ سیدھا اپنے دوست المعروف سیٹھ بستہ کے پاس گئے۔ جو اکثر ان کے اعلانیہ اور خفیہ کاموں میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ اس سے اس کی پینٹ اور شرٹ یہ کہہ کر ادھار لی کہ ایک ضروری شادی پر جانا ہے۔ بس ایک ہفتے کی دیر ہے وہ اسے نیا سوٹ خرید کر دیں گے۔ ایک دوسرے دوست سے چند سو ادھار لئے۔ اس وعدے پر کہ اسی ماہ ڈبل واپس کریں گے۔ لیکن اگلی بات نہ بتائی۔ باؤ کچھن اپنے دوستوں اور محلے والوں کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ انہیں پکا یقین تھا کہ میڈم نزہت ان کی طرف سے شادی کے پیغام کو رد کر ہی نہیں سکتیں۔

اپنے دونوں دوستوں کو حیران چھوڑ کر وہ سیدھا دولہا بیوٹی پارلر پہنچ گئے۔ دو اڑھائی گھنٹوں کی محنت شاقہ اور اڑھائی ہزار روپے کے خرچہ کے بعد ان کی ڈینٹنگ و پینٹنگ مکمل ہوئی۔ اب اگلا مرحلہ تھا کہ دل کی بات میڈم تک کیسے پہنچائی جائے۔

''میں کسی قاصد کا احسان کیوں لوں۔ دو دلوں کی بات فی الحال دو دلوں کے درمیان ہی رہے تو اچھا ہے۔ ولیمہ پر سب کو پتہ چل ہی جائے گا۔'' تو گویا شادی کی بات ففٹی ففٹی پکی تھی۔ لڑکا تیار تھا صرف لڑکی کی ہاں کی ضرورت تھی۔ باؤ کچھن کو اپنی صلاحیتوں پر پختہ یقین تھا۔ بس ایک دفعہ لڑکی سامنے آ جائے، وہ انکار کر ہی نہیں سکتی اور یوں باؤ کچھن بغیر سہرے کے دولہا بن کر میڈم نزہت کے مکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میڈم کا مکان کچھ ایسا تھا کہ کہ سب سے پہلے ایک کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ اور ایک کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ یہ بطور بیٹھک استعمال ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی۔ اس کے آگے مختصر صحن اور آخر میں دو کمرے، کچن وغیرہ۔ مکان کا بیرونی دروازہ جالی دار تھا۔ جس کے ذریعے بغیر اسے کھولے دیکھا جا سکتا تھا کہ باہر کون کھڑا ہے۔ گلی سے گزرنے والے کسی شخص نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ باؤ جی آج بن سنور کر کیوں کھڑے ہیں۔ پورا محلہ جانتا تھا کہ باؤ کچھن کی روزمرہ حرکتیں کسی کے لئے بھی باعث نقصان نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ صرف باؤ کچھن ہی جانتے تھے کہ ان کا یہاں کھڑا ہونا کس عظیم مقصد کے لئے ہے۔ وہ تو ایک بیوہ کی مدد کر کے اس کا بڑھاپا آسان بنانا چاہتے تھے۔

سخت گرمی کا موسم، دھوپ سے ان کا میک اپ پگھلنا شروع ہو چکا تھا۔ تین گھنٹے کے اذیت ناک انتظار کے بعد امید کی کلی کھلنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ میڈم نزہت پھلوں کے چھلکے بیرونی دروازے پر رکھے کوڑے دان میں ڈالنے کے لئے جالی والے دروازے کے قریب آئی۔ اچانک ان کی نظر گلی میں سامنے کھڑے باؤ کچھن پر پڑی۔ اُدھر جب باؤ کچھن نے میڈم کو جالی کی اوٹ میں دیکھا تو ان کے تن مردہ میں جان آ گئی۔ آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گلی میں سنسان کا عالم تھا۔ یہی وقت تھا ''جھٹ منگنی پٹ بیاہ'' کو ثابت کرنے کا۔ باؤ کچھن نے جھٹ دایاں ہاتھ دل کی جگہ پر رکھا، تھوڑا سا جھکے اور پھر فرشی سلام پیش کر دیا۔ میڈم جی اِس اچانک دل نوازی پر حیران ہو گئیں۔ ان کی اس محلے میں ایک عمر گزری تھی۔ کسی نے آج تک انہیں غلط نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ باؤ کچھن کی حرکات و کیفیات کا جائزہ لینے کے لئے تھوڑی دیر رکیں اور اندر چلی گئیں۔ باؤ کچھن کا یقین پختہ ہو گیا کہ میڈم نزہت تک ان کے دل کی بات پہنچ گئی ہے، اسی لئے تو وہ اتنی دیر ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر جالی کی اوٹ سے انہیں دیکھتی رہی تھیں۔

''آخر اکیلی عورت کے لئے مرد کا سہارا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اماں اور ابا نے مجھے سوائے بھوک اور طعنوں کے اور دیا ہی کیا ہے۔ میں میڈم کی اتنی خدمت کروں گا کہ وہ زندگی کے سارے غم بھول جائیں گی۔''

اور دوسری طرف میڈم نزہت سوچ رہی تھیں ''میں اس سوکھی ٹانگوں والی ٹیڑھی میڑھی مخلوق کو بے ضرر سمجھا کرتی تھی۔ اس کی اتنی ہمت۔ اس کا مستقل اور با عزت حل نکالنا ضروری ہے ورنہ ۔۔۔''

میڈم نزہت جالی والے دروازے سے پرے ہٹیں تو باؤ کچھن دل ہی دل میں شادمانیوں کی قلابازیاں کھاتے ہوئے

گھر پہنچے۔
گھر میں قدم رکھتے ہی ان کا سامنا ابا حضور سے ہوا جو غالباً اُنہی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے باؤ کچھن کو نیم دولہا بنے دیکھا تو خاموشی سے گھر سے باہر نکل کر گلی میں جھانکا کہ ساتھ کوئی دوسری مخلوق تو نہیں۔ لیکن گلی سنسان تھی۔ وہ جلدی سے باؤ کچھن کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اماں حضور پہلے ہی وہاں قدم رنجہ فرما چکی تھیں۔

''یہ بہو کا کیا چکر ہے بھئی؟'' ابا اور اماں کا مشترکہ سوال تھا۔

''آپ دونوں مجھے نکما اور ٹیڑھا میڑھا کہتے تھے۔ اب چند دن اور انتظار کریں پھر دیکھیں اس گھر کے حالات کیسے بدلتے ہیں۔''

''لیکن وہ ہے کون؟'' ابا بولے۔

''ابا۔ آپ کو کھاتی پیتی بہو چاہئے یا نہیں؟'' باؤ کچھن کا لہجہ یکدم تلخ ہو گیا ''لڑکی خوبصورت ہے اور بہت مالدار ہے۔ اس نے مجھے خود شادی کی پیش کش کی ہے!'' باؤ کچھن پر خود فریبی کا بھوت پوری طرح سوار ہو چکا تھا ''اب آپ جائیں اور مجھے کچھ سوچنے دیں!!''

اماں اور ابا جو پہلے ہی اس کی حرکتوں سے پریشان رہتے تھے، اس کی باتیں سن کر آبدیدہ ہو گئے۔ اور سوچنے لگے اگر کسی نے ان کی اکلوتی اولاد کا بھوت اُتارنے کے لئے اس کی ٹانگوں پر ہلکی سی چھڑی بھی ماردی تو ہڈیاں چورا چور ہو جائیں گی۔ باؤ کچھن کی اماں کی آنکھیں کسی آنے والے طوفان کے خوف سے نم ہو گئیں۔ دونوں چپ چاپ اٹھ کر صحن میں اُگے دھریک کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔

باؤ کچھن عشق کا پہلا مرحلہ کم ترین وقت میں اتنی کامیابی سے طے ہونے پر بہت خوش تھے۔ انہیں ان نوجوانوں کی قسمت پر رونا آ گیا جو اپنے محبوب کو پانے کے لئے کئی کئی مہینے بلکہ سال اس کے در کے چکر لگاتے ہیں لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

''بندے بندے میں بھی فرق ہوتا ہے ناں جی۔ بس لڑکی کو رام کرنے کے لئے اپنے اندر حوصلہ اور صلاحیت ہونا چاہئے۔ میرے اندر یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔''

باؤ کچھن کی سوچ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ اب اگلا مرحلہ کیا ہو۔ بھوک اور پیاس سے بے نیاز وہ گہرے مراقبے میں چلے گئے۔ پھر ان کے ذہن میں غسلخانے کا چکر لگائے بغیر کمرے میں لیٹے لیٹے ہی ایک خیال کوندا۔ انہوں نے مدعائے دل کے نفسِ مضمون پر غور کرتے کرتے پوری رات گزار دی۔ ادھر فجر کی اذانیں فضا میں بلند ہوئیں ادھر باؤ کچھن نے اپنا حال دل ایک رنگین اور منقش کاغذ پر منتقل کیا اور صبح کا انتظار کئے بغیر چپکے سے اسے میڈم کی ڈیوڑھی کے جالی دار دروازے کے نیچے سے اندر دھکیل کر گھر چلے آئے مبادا کوئی انہیں دیکھ لے۔ اس کام میں راز داری بہت ضروری تھی۔ انہیں اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ ان کی دیدہ دلیری کو میڈم نزہت کی رضامندی سمجھ کر محلے میں سے ایک بھی دوسرا امیدوار اس میدان میں کود پڑا۔ تو پھر باؤ کچھن کے لئے دریائے عشق کو پار کرنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ ابھی ان کا گھڑا کچا تھا۔

صبح دودھ والے نے میڈم نزہت کے دروازے پر دستک دی۔ وہ برتن لے کر جب ڈیوڑھی میں آئیں تو خوشبو کے ایک جھونکے نے ان کا استقبال کیا۔ ابھی وہ حیران ہوا ہی چاہتی تھیں کہ ان کی نظر نیچے پڑی جہاں ان کے ''یک طرفہ عاشق'' کا محبت نامہ شرف قبولیت کا منتظر تھا۔ دن کی بات کچھ اور تھی لیکن رات کے اندھیرے میں اس طرح کی حرکت سے میڈم پہلے تو تھرا گئیں۔ پھر سنبھل گئیں۔ وہ ایک جہاندیدہ عورت تھیں۔ انہوں نے اس سلسلۂ جنبانی کو جلد سے جلد انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ مبادا محلے میں کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو ساری عمر کی عزتِ سادات جاتی رہے گی۔ اِس معاملے پر خوب سوچ بچار کرنے کے بعد بالآخر انہیں اس سے پیچھا چھڑانے کا شافی حل نظر آ گیا۔ انہوں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مختصر سی تحریر لکھی اور باؤ کچھن کو ایک ہفتہ بعد اپنے گھر میں چائے کی دعوت دے دی۔

میڈم نزہت کی ایک بھانجی رخشی راولپنڈی میں میڈیکل کالج کی طالبہ تھی۔ میڈم نے اسے فون کر کے بلا لیا اور تاکید کی کہ

ہو سکے تو ایک دو انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بھی ساتھ لیتی آئے۔ شہر کی ایک پری میڈیکل کی طالبہ کو انہیں دیکھنے کا شوق ہے۔ رخشی تیسرے ہی روز اپنے بھائی کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر آ گئے۔

دوسری طرف باؤ چھن کے لئے تو ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل تھا۔ ایک ہفتہ کیسے گزارتے۔ ان کے کانوں میں گانا ”اسی لئے ممی نے میری تمہیں چائے پے بلایا ہے۔“ بار بار گونجنے لگا۔ لیکن یہاں تو خود ان کی محبوبہ نے انہیں چائے کی دعوت دی تھی۔ اس کے لئے کوئی مناسب گانا ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ یکا یک ان کے ذہن میں فوراً انڈین اداکار امیتابھ بچن آ گئے جنہوں نے ایشوریا رائے کو اپنی بہو بنانے کے لئے ننگے پاؤں حضرت خواجہ معین الدین ؒ کے مزار پر حاضری دی تھی۔

”ہندو ہو کر بھی اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ میں تو پھر مسلمان ہوں۔ میری دعا کیوں قبول نہیں ہو گی!“

باؤ چھن نے یہی سوچ کر سات میں سے پانچ دن مختلف بابوں کے مزاروں کے چکر لگانے اور وہاں کا متبرک لنگر کھانے میں گزار دئے۔ آخر کسی نہ کسی در سے تو دعا کی قبولیت کی سند ملے گی۔ انہوں نے یہ بھی سوچ لیا کہ نئی دلہن کے لئے اپنے آبائی گھر کو سجانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ انہوں نے کون سا اس گھر میں رہنا تھا۔ وہ تو نکاح بھی میڈم نزہت کے گھر پڑھوانے اور پھر ساری عمر وہیں پڑا رہنا چاہتے تھے۔ بھلا میڈم کو اس سے انکار بھی کیوں ہو سکتا تھا۔ وہ اس دنیا میں اکیلی تھی۔ باؤ چھن اور میڈم نزہت آرام سے اس گھر میں گزر بسر کر سکتے تھے۔ رہی بات اماں اور ابا کی تو وہ اسی آبائی گھر میں خوش ہیں۔ ویسے بھی انہیں ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں ان کی وجہ سے میڈم ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ باؤ جی اب میڈم کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ پانچ دن مختلف بابوں کے مزاروں پر دعا کرتے گزر گئے۔

باؤ چھن نے گھر واپس پہنچتے ہی اپنے ایک تیسرے دوست سے ایک ہفتے کے وعدے پر خاصی رقم ادھار لی۔ میڈم کے لئے ایک مہنگا برانڈڈ سوٹ، جوتا اور پرفیوم خریدے۔ ان چیزوں کا گفٹ پیک اس انداز سے تیار کیا کہ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو اسے

آج اک اور حسینہ کو ظفرؔ
گملا دیتے ہوئے ہر یاد آیا

شک نہ گزرے کہ یہ کیا، کیوں اور کس مقصد کے لئے ہے۔ دوپہر کے سوا دو بجے جب گلی سنسان ہو گئی تو باؤ چھن، گفٹ پیک کے ساتھ میڈم نزہت کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ میڈم نے یہی وقت دیا تھا۔ چند منٹ بعد ہی میڈم نزہت نے جالی دار دروازے کے پیچھے سے جھانکا۔ باؤ چھن کو سامنے پا کر دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ باؤ جی خوشی سے نہال، یوں لجاتے، شرماتے اندر داخل ہوئے جیسے وہ واقعی اس گھر کے داماد ہوں۔

”جی تشریف لائیے!“ میڈم نزہت نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا اور بیٹھک میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ باؤ جی نے میڈم کو گفٹ پیک پیش کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے ”بہت شکریہ“ کہہ کر اسے بیٹھک میں ہی میز پر رکھنے کا کہا۔ باؤ جی خوشی سے پاگل ہوئے سوچ رہے تھے ”میڈم تو پہلے سے ہی تیار تھیں۔ کاش میں چند سال پہلے ہی انہیں اپنی محبت کا یقین دلا دیتا۔ کاش کاش

تیغ الہٰ آبادی سے کسی نے پوچھا ''کیا آپ کی شادی ہوگئی ہے؟'' اِس سے پہلے کہ تیغ کچھ جواب دیتے، شمیم کرمانی نے کہا ''اجی قبلہ کون ایسا ظالم باپ ہوگا جو اپنی بیٹی کو تہِ تیغ کرنے کا سوچے گا۔'' میں نکاح خواں کو بھی ساتھ ہی لے آتا۔''

باؤ چھن پرانی طرز کے صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ میڈم نے ایک کونے میں پڑی صاف ستھری میز گھسیٹ کر ان کے سامنے کردی اور میز کے دوسری طرف خود کرسی پر بیٹھ گئیں۔ باؤ جی نے گفٹ پیک میز کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ فی الحال لب خاموش تھے، صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ میڈم نزہت، باؤ جی کی کیفیت سے خاصی محظوظ ہو رہی تھیں۔ اس بڑی میز کے ساتھ ایک چھوٹی میز تھی جس پر تین نیلے رنگ کے شاپر رکھے ہوئے تھے۔ باؤ چھن کی نظر ان پر پڑی تو سوچا ''یقیناً یہ میرے لئے قیمتی تحفے ہوں گے۔ ایک میرا، ایک ابا اور ایک اماں کے لئے۔ میڈم نزہت تو واقعی میری قدر دان اور دل کی بڑی امیر تھی۔''

''رخشی! چائے لے آؤ!''۔ میڈم نے اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ باؤ چھن چونکے۔ میڈم فوراً بھانپ گئیں اور بولیں ''یہ میری بھانجی ہے۔ دو دن پہلے راولپنڈی سے آئی ہے۔ اور آج ہی شام کو واپس چلی جائے گی۔''

باؤ جی کی جان میں جان آئی۔ چند لمحے بعد ہی رخشی ٹرے میں دو کپ اور کچھ اعلیٰ قسم کے بسکٹ رکھے اندر داخل ہوئی۔ اگر چہ وہ میڈم سے زیادہ خوبصورت اور جوان تھی لیکن باؤ جی کی نظر تو میڈم کی دولت پر تھی۔ جس کے وہ واحد مالک و مختار بننا چاہتے تھے۔ جب میڈم باؤ جی کو خود چائے کا کپ پکڑانے لگیں تو باؤ جی نے کپ کی بجائے ان کا ہاتھ چھونے کی کوشش کی۔ میڈم اس حملے کے لئے پہلے سے تیار تھیں۔ انہوں نے کپ کو دو انگلیوں میں پکڑا اور باؤ جی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ باؤ جی، میڈم کی اس ادا پر بھی مر مٹے۔ چائے کے دوران دونوں کے درمیان سوائے مسکراہٹوں کے تبادلے کے منہ سے کوئی بات نہ ہوئی۔

''آپ نے خوامخواہ اس گفٹ کا تکلف کیا۔'' چائے کے بعد میڈم نے سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

باؤ جی کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ مبادا اُن کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے میڈم ناراض ہو جائیں۔ وہ بس میڈم کو تکے جا رہے تھے۔ کن انکھیوں سے کمرے کا جائزہ بھی لیتے رہے کہ نکاح کے بعد کون سی چیز کہاں رکھنی ہے اور کس کو نکال کر اس کی جگہ نئی چیز خریدنی ہے۔

رخشی اس وقت تک کمرے میں ہی انجان بنی بیٹھی تھی۔ میڈم نے اشارہ کیا اور وہ خالی کپ اور ٹرے اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''میں آپ کو اپنی کچھ خاندانی چیزیں دکھانا چاہتی ہوں، امید ہے آپ جیسی باذوق شخصیت کو پسند آئیں گی۔''

اپنی اس قدر پذیرائی دیکھ کر باؤ چھن کا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ انہوں نے سوچا، خاندانی زیور ہوں گے، جو اب ان کی ملکیت بننے والے تھے۔

میڈم نے چہرے پر بدستور مسکراہٹ سجائے ایک شاپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کھولنے کا کہا۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ میں گھر جا کر کھول لوں گا۔'' باؤ چھن نہیں چاہتے تھے کہ ان کو ملنے والے تحفے راستے میں ہی کھل جائیں۔ میڈم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ انہوں نے چھوٹی میز سے ایک شاپر اٹھایا اور چائے والی میز پر رکھ دیا۔

''اِسے میں کھولوں یا آپ زحمت کریں گے؟'' میڈم کی شیریں بیانی نے باؤ جی کو مکمل گھائل کر دیا۔ باؤ جی نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو میڈم نے خود اسے کھولا۔ اس میں سے ایک انسانی کھوپڑی اور چند ہڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ اب یہاں وہی انڈین فلم مغل اعظم والا سین شروع ہوگیا۔ مغل بادشاہ کا دربار لگا ہوا ہے۔ شہزادہ سلیم اور شہنشاہ اکبر، کنیز انارکلی سے گانا سنتے ہیں ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا!'' جب گانا شروع ہوتا ہے تو جہاں پناہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اور خوشی دوڑ رہی ہے۔ پھر جب گانے کے وسط میں انارکلی لہراتی، گاتی، مچلتی شہزادہ سلیم کے ڈب سے خنجر نکال کر خاص انداز سے جھومتی اس خنجر کو جہاں پناہ کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہتی ہے ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا'' تو بادشاہ سلامت

کے چہرے سے یکدم مسکراہٹ غائب ہو کر غصے کی ایسی لہر نمودار ہوتی ہے کہ ان کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ ملکہ خوف سے سٹ جاتی ہے۔ یہی عالم اب باؤ چھن کا تھا لیکن انداز مختلف تھا۔ باؤ چھن جو چند لمحے پہلے اپنے آپ کو اس گھر کا داماد سمجھ رہا تھا۔ ان کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ پھر یہ سوچ کر سنبھل گئے کہ شائد گھر داماد کی جوتیاں چھپانے یا اسے دودھ میں مرچیں ڈال کر پلانے کی جگہ مذاق کا یہ نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے۔ وہ چپ بیٹھے رہے۔

''میں نے سوچا آپ کو اس خاندانی حقیقت سے آگاہ کر دوں'' میڈم نزہت بدستور مسکراتے ہوئے بولیں ''میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز میں کالج جانے کے لئے گھر سے نکلی تو دیکھا کہ ایک لڑکا میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میری خاموشی سے چند روز میں اس کی ہمت اتنی بڑھی کہ ایک دن اس نے مجھے لڑکیوں کے سامنے پھول پیش کر دیا۔ میں اس وقت خاموش رہی۔ گھر آ کر اماں کو سب بتا دیا۔ تیسرے دن میرا بڑا بھائی ایک خون آلود تھیلا لے کر گھر آیا۔ اس میں اسی لڑکے کا کٹا ہوا سر تھا۔ اس کا دھڑ اس نے چھ کلومیٹر دور دریا میں بہا دیا تھا۔''

میڈم بغیر رکے داستان بیان کر رہی تھی ''ہمارے خاندان میں رواج ہے کہ دشمن کا سر کاٹ کر اسے گھر میں سجا لیتے ہیں اور دھڑ کو ایسی جگہ پھینکتے ہیں کہ ساری عمر اس کا سراغ نہیں ملتا۔''

باؤ چھن کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ خوف سے ان کی پینٹ گیلی ہوگئی۔ پھر میڈم نے دوسرے دو شاپر بھی کھولے اور ان سے دو انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

''یہ بھی ان نوجوانوں کی ہیں جنہوں نے ہمارے خاندان کی لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھا تھا۔'' میڈم نے یہ کہا اور باؤ چھن بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے ''اندر میرا بھانجا بھی آیا ہوا ہے۔ کیوں نہ میں آپ کا تعارف اس سے کروا دوں؟'' میڈم ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر اندر جانے لگیں۔ جونہی انہوں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ باؤ چھن نے اپنا لایا ہوا گفٹ پیک وہیں چھوڑا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ گرمی ویسے بھی زوروں پر تھی۔ خوف سے ہانپتے کانپتے بڑی مشکل سے گھر پہنچے۔ یوں لگا جیسے کئی کلومیٹر پیدل چل کر آئے ہیں۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گرے۔ دوسرے دن جا کر انہیں ہوش آیا۔ تو دیکھا بجلی بند ہے۔ اماں دیسی پنکھا جھل رہی ہیں اور پسینے میں شرابور محلے کا ''ڈاکٹر'' انہیں ہوش میں لانے کے لئے ٹیکہ لگا رہا تھا۔ اماں اور ابا کا خیال تھا کہ ان کی اکلوتی اولاد کو خوبصورت کپڑوں اور خوشبو میں لپٹے دیکھ کر کسی جنّی نے وار کر دیا ہے۔

ادھر جب میڈم نزہت مسکراتی ہوئی اندر گئیں تو ان کی بھانجی باؤ چھن کو تیزی سے باہر گلی میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا ''آنٹی یہ کون تھے؟''

''یہ دوسرے محلے کا نوجوان تھا۔ اس کی رشتہ دار بھی میڈیکل میں داخلہ لینا چاہتی ہے۔'' میڈم نزہت نے بات ہی بدل دی۔ ''میں نے اسے تمہارے شاپروں سے کھوپڑیاں دکھائیں تو اس کی نظروں کے سامنے مردے ناچنے لگے اور وہ ڈر کر چلا گیا ہے۔''

''ڈرپورک کہیں کا!'' رخشی حیران ہو کر بولی۔ پھر وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

''دیکھو وہ تمہارے لئے کیا تحفہ لایا تھا۔ کام کا ہو تو ساتھ لے جانا ورنہ وہاں کسی جاننے والی کو دے دینا۔'' میڈم نزہت نے رخشی کہا۔

اِس کے بعد کئی ہفتوں تک میاں چھن اس گلی میں نہ دیکھے گئے۔

محمد اشفاق ایاز کا تعلق جلالپور جٹاں (گجرات) سے ہے۔ اُردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ سنجیدہ نثر نگاری کا سفر پاکستان کے مختلف جرائد و اخبارات سے ہوتا ہوا ماہنامہ ''چاند'' اور ''زیر لب'' میں مزاحیہ نثر نگاری تک جا پہنچا۔ انگریزی تحریروں کو اُردو میں بھی منتقل کیا۔ افسانے بھی تخلیق کئے۔ موڈ اچھا ہو تو شاعری میں بھی لفظ جوڑ لیتے ہیں۔ ویب سائٹ vojpj.com کے ایڈیٹر ہیں۔

کے ایم خالد

مجھے دفتر آنے کے لئے عموماً لفٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ میرا دفتر کسی مین روڈ پر نہیں ہے اور اگر میں اپنے گھر سے مین روڈ تین کلومیٹر پیدل آ بھی جاؤں تو دفتر تک مجھے تین ویگن بدلنا پڑتی ہیں۔اس قباحت سے بچنے کے دو حل ہیں، یا تو ٹیکسی لوں یا پھر لفٹ، ٹیکسی میں افورڈ نہیں کرسکتا اس لئے مجھے ہفتے میں پانچ دن لفٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ ہفتہ اتوار دفتر بند ہوتا ہے۔میں لفٹ لینے کے لئے عموماً سڑک کے بیچ تک چلا جاتا ہوں جس سے بعض اوقات گاڑی یا موٹر سائیکل کے ڈرائیور کو ہنگامی بریک بھی لگانے پڑ جاتے ہیں لیکن میرے اس عمل سے مجھے لفٹ ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اس سوموار مجھے مین روڈ تک پہنچتے کافی دیر ہو چکی تھی میں نے ایک سرخ رنگ گاڑی کو دیکھا اس کی رفتار قدرے تیز تھی میں نے اپنا طریقہ آزمایا اور ڈرائیور کو مجھے بچانے کے لئے ہنگامی بریک لگانے پڑے۔وہ مجھے شیشے میں سے غصے سے دیکھ رہا تھا میں لفٹ کے لئے انگوٹھے کا اشارہ کیا اس نے قریب آنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیور کے ساتھ والا فرنٹ دروازہ کھول دیا ’’چوٹ تو نہیں لگی؟‘‘

’’نہیں!‘‘ میں سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

’’کہاں جانا ہے۔۔۔؟‘‘ اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے اپنے دفتر کے قریب چوک سے آگاہ کیا۔

دفتر کے قریب اترتے ہوئے میں نے اس سے کہا ’’معافی چاہتا ہوں میں نے آپ کو تنگ کیا۔‘‘

’’نہیں کوئی بات نہیں، مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوئی۔‘‘

دوسرے دن مجھے پھر اسی وقت پر وہی کار نظر آ گئی اور میں نے اس کے ساتھ کل والی حرکت دہرا دی۔ مجھے اس گاڑی والے نے خوش دلی سے پھر ڈراپ کر دیا میں نے اترتے ہوئے پوچھا ’’آپ کو روٹ یہی ہے؟‘‘

’’نہیں، روٹ تو یہ نہیں لیکن۔۔۔‘‘

’’لیکن کیا۔۔۔؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

لیکن اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس سے اگلے دن پھر مجھے لفٹ مل گئی زندگی کچھ پرسکون سی محسوس ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اسی لفٹ کے سہارے یہ پورا ہفتہ اختتام پذیر ہوا۔ دو دن کی چھٹی کے بعد سوموار کے روز میں پھر اسٹاپ پر تھا لیکن سرخ رنگ کی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے کسی موٹر سائیکل والے سے لفٹ لینے کا سوچا۔ اتنی دیر میں مجھے وہی گاڑی نظر آگئی۔ میں فوراً لفٹ کے لئے انگوٹھا اٹھائے سڑک کے درمیان تک پہنچ گیا۔ نوجوان نے گاڑی روک لی اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ابھی میں دفتر سے کافی پیچھے تھا کہ اس نے گاڑی روک دی اور میری طرف دیکھنے لگا مجھے اس کے اس طرح دیکھنے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی "کیا بات ہے۔۔۔؟" میں گھبراتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ سے ایک بات کرنا تھی سوچ رہا ہوں کروں یا نہ کروں!"

"ہاں، ہاں کہیں!!" میں نے بڑی مشکل سے کہا

"بات یہ ہے میرے والد صاحب بیمار ہیں اور ان کو ایک گردے کی اشد ضرورت ہے اور اس بیماری کے ساتھ انہیں جگر کے ٹرانسپلانٹ کے لئے بھی ایک ڈونر کی ضرورت ہے۔ اگر آپ
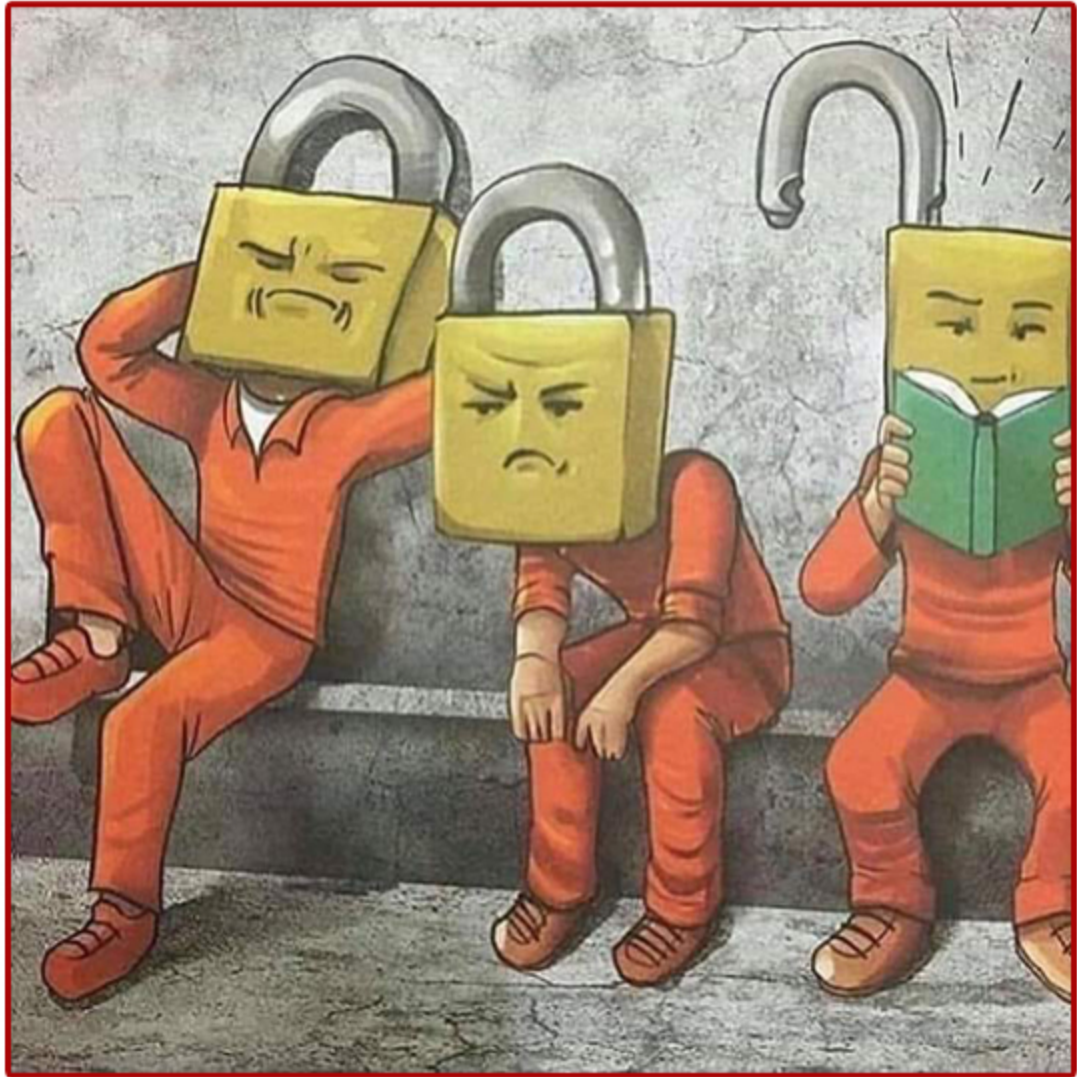
ہماری یہ مشکل حل کر دیں تو۔۔۔''اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی یوں لگ رہا تھا جیسے جسم میں خون کی جگہ چیونٹیاں سی رینگ رہی ہوں وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
''گاڑی ہسپتال کی طرف موڑوں؟ چلیں آج ٹسٹ تو کروا لیں!''اس نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے کہا۔
میں یک دم ہوش میں آ گیا''وہ بات دراصل یہ ہے دفتر میں میرے ذمے ایک اسپیشل اسائمنٹ ہے،اور گھر بھی بتانا ہوگا، میں آپ کو کل بتاؤں گا۔''میں نے اسے اعتماد میں لیا۔
''ڈاکٹر نے ایک ہفتے میں سارے انتظامات کا کہا ہے، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں، میں آپ کا کل انتظار کروں گا اور ایک اور بات آپ نے ہسپتال میں اپنے آپ کو ابا جان کا بھائی ظاہر کرنا ہے یہ ہسپتال والوں کی طرف سے مجبوری ہے۔''
''ٹھیک!'' کہتے ہوئے میں نے دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔
''وہ ابھی آپ کے دفتر والا اسٹاپ تو آیا ہی نہیں۔''اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
''میں بس چلا جاؤں گا۔''میں نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔
کبھی ذہن میں آتا شاید اس نے میری لفٹ سے جان چھڑانے یہ ساری کہانی گھڑی ہو لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر دل بیٹھ جاتا کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہو۔
مجھے دفتر میں ہی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ظہر کی نماز تک میں اچھا بھلا بخار میں تپ رہا تھا۔سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔افسر نے میری حالت دیکھتے ہوئے اپنے چپڑاسی کو مجھے موٹر سائیکل تک گھر چھوڑنے کے لئے کہا۔چپڑاسی مجھے گھر چھوڑ گیا۔بخار کی شدت کم نہ ہو سکی۔بیوی اور بچے پریشان تھے۔جسم کانپ رہا تھا لیکن ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہا انہیں ملیریا نہیں ہے،کوئی خوف ہے جس کی وجہ سے ایسا بخار ہوا ہے۔
دوسری صبح میں نے اپنے بیٹے کو گاڑی کو نمبر دیا اور اسٹاپ تک بھیجا کہ چیک کرو یہ گاڑی تو وہاں نہیں کھڑی۔تقریباً ایک گھنٹے بعد بیٹے نے آ کر بتایا کہ گاڑی اسٹاپ پر پچیس منٹ کھڑی رہی۔
میں نے دفتر سے چھٹی کر لی۔بخار اترتا، پھر چڑھ جاتا۔جسم سے گردے اور جگر کھسکتا ہوا محسوس ہوتا۔
دوسرے دن بھی مخبر یہی خبر لایا کہ گاڑی وہاں ایک گھنٹہ کھڑی رہی۔تیسرے دن بھی حالات یہی رہے، گاڑی بھی گھنٹہ کھڑی رہی۔اس کے بعد ہفتہ اور اتوار کے دن تھے ان دنوں میں گاڑی بھی نظر نہیں آئی اور طبیعت بھی کچھ بہتر ہوئی۔
میں اپنے بیٹے کے ساتھ بازار گیا اور ایک بائیس نمبر کی بائیسکل لے آیا۔گھر والے اس تبدیلی پر حیران تھے۔بیگم نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور کہا''جب میں کہتی تھی کہ سائیکل پر دفتر چلے جایا کرو تو اس وقت کہتے تھے اب بڑھاپے میں مجھ سے سائیکل نہیں چلتی اور اب اپنی مرضی سے جو مرضی کرو''
''بیگم گردے اور جگر بھی تو بچانا ہے۔''
''کیا مطلب۔۔۔؟''بیگم نے حیرانی سے کہا۔
''مطلب سائیکل ایک ورزش ہے سائیکل چلاؤں گا تو تندرست رہوں گا۔''
اور بیگم کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے مسکرا دی۔

کے ایم خالد صاحب راولپنڈی میں مقیم ہیں۔موصوف عرصۂ دراز سے لکھ رہے ہیں۔اب تک ہزاروں کی تعداد میں مضامین، کالم اور ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ٹی وی کے بہت سے چینلوں پر ان کے ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں۔اِن دنوں ''مزا۔مت'' کے عنوان سے ایک اخبار میں کالم بھی لکھ رہے ہیں۔خالد صاحب کے اسلوبِ بیان اول تا آخر فکاہی ہے۔ ان کے ہاں طنز کی بے مثال چاشنی پائی جاتی ہے۔اِن کی مختصر کہانیاں خاصے کی چیز ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور یہاں کی رونقوں میں ان کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔

اقبال حسن آزاد

نقلی آئی ڈی

نام تو ان کا کچھ اور تھا لیکن ننجن بھائی کے اسم گرامی سے مشہور تھے۔ شرارتیں کرنا اور دوسروں کو تنگ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ دورانِ سفر اجنبیوں کو کبھی اپنی اصل شناخت نہیں بتاتے تھے۔

جب سے فیس بک منظر عام پر آیا تو انہیں ایک نیا مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔ ایک آئی ڈی تو موصوف نے اپنے اصل نام سے بنائی اور کئی فیک آئی ڈیز مختلف ناموں سے بھی بنا ڈالیں۔ ان نقلی آئی ڈیز کی آڑ میں انہیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک نادر موقع ہاتھ آ گیا۔ کبھی کسی کی پگڑی اتار دی، کبھی کسی کو سر عام ذلیل کر دیا۔ کبھی ایک فیس بک فرینڈ کا دوسرے دوست سے جھگڑا کروا دیا

اور کبھی تو کسی کو ہمیشہ کے لیے فیس بک کو خیرآباد کہنے پر مجبور کر دیا۔

اِدھر کچھ عرصہ سے فیس بک نئے نئے اپلیکیشنز لے کر آنے لگا۔ کبھی کہا جاتا کہ ''جانئے! آپ کا سچا دوست کون ہے؟'' کبھی کہا جاتا کہ ''جانئے، جب آپ اسی برس کے ہو جائیں گے تو کیسے لگیں گے۔'' یا پھر یہ کہ ''جانئے، آپ کی موت کب اور کیسے ہو گی؟'' وغیرہ وغیرہ اور ہمارے ججّن بھائی اس قسم کے کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

ایک دن وہ فیس بک پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نیا اعلان سامنے آیا۔

''آپ ہم سے کوئی بھی سوال کیجئے۔ ہم اس کا بالکل صحیح صحیح جواب دیں۔ اگر آپ ہمارے جواب سے مطمئن نہ ہوں تو ہمیں بتائیں۔ ہم اسے درست کرنے کی کوشش کریں گے۔''

ججّن بھائی اس وقت اپنی ایک فیک آئی ڈی کھول کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوچھا ''میرا اصلی نام کیا ہے؟''

فیس بک نے صحیح صحیح جواب دے دیا۔ ججّن بھائی حیران رہ گئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرا سوال کیا۔ اس کا بھی انہیں صحیح جواب مل گیا۔ اب تو بھائی صاحب کی دلچسپی بڑھ گئی اور انہوں نے پے در پے کئی ایسے سوال کر ڈالے جن کا جواب ان کی دانست میں کوئی نہیں دے سکتا تھا مگر ہر بار انہیں بالکل صحیح جواب ملا۔ پھر دھیرے دھیرے ان پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی۔

''یہ کم بخت فیس بک تو میرے اندر باہر سے پوری طرح واقف ہے۔ کوئی ایسا سوال کرنا چاہیے جس کا جواب یہ نہ دے سکے۔''

پھر بہت سوچنے کے بعد انہوں نے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب دینا فیس بک کے لیے مشکل ہوتا۔ انہوں نے پوچھا۔

''یہ بتاؤ۔ اس وقت میرے والد صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

''فیس بک نے جواب دیا ''آپ کے والد صاحب اس وقت مونا پکچر پیلیس میں فلم دیکھ رہے ہیں۔''

ججّن بھائی کے حلق سے بے اختیار ایک قہقہہ بلند ہوا اور انہوں نے جلدی جلدی ٹائپ کیا ''غلط، بالکل غلط، میرے والد صاحب تو بیس برس قبل ہی انتقال فرما چکے ہیں۔''

فیس بک نے جواب دیا ''بیس برس پہلے جن صاحب کا انتقال ہوا تھا وہ آپ کی والدہ کے شوہر تھے۔ آپ کے والد صاحب اس وقت مونا پکچر پیلیس میں فلم دیکھ رہے ہیں۔''

اقبال حسن آزاد کا تعلق صوبۂ بہار (بھارت) سے ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مونگیر میں مقیم ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک افسانوں کے تین مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' (۲۰۰۵)، ''مردم گزیدہ'' (۲۰۰۵) اور ''پورٹریٹ'' (۲۰۱۷) شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ''اوس کے موتی'' زیرِ ترتیب ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے خصوصی کرمفرما ہیں۔

دیہات کے بیشتر اور شہر کے بعض گھرانوں میں ایک رسم یہ ہے کہ فوتیدگی کی صورت میں برادری کی خواتین اپنے گھر سے مرنے والے کے گھر تک ننگے پاؤں بین کرتی آتی ہیں۔ گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے ان کی آہ و زاری بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ گھر کی دہلیز میں قدم رکھتی ہی اور اس کے ساتھ ہی کہرام مچ جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ باری باری مرنے والے کے قریبی لواحقین کو جپھا ڈال کر رونے جیسی آوازیں نکالتی ہیں۔ وہ اپنی خشک آنکھیں چھپانے کے لیے لمبا گھونگھٹ نکال لیتی ہیں تاہم ارد گرد رونے کرلانے کے دوران ان کی خشک آنکھیں نظر آ جائیں تو بھی یہ کوئی معیوب امر نہیں گردانا جاتا' کیونکہ دونوں پارٹیوں کے درمیان یہ چیز Understood ہوتی ہے۔

غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور از عطاء الحق قاسمی

مزاحیہ

ناگہانی دعوت

ذیشان فیصل شانؔ

دو ہفتے قبل ایک بس سٹاپ پر دورانِ انتظار یہ آواز دو بار زبردستی میرے کانوں کے پردے پھاڑتی میرے پہلے سے پھٹے ہوئے دماغ تک پہنچی۔ گو آواز سے زیادہ انداز اس طرح کا تھا کہ انور مسعود صاحب کی شاعری بھی شرما جائے، لہٰذا بزورِ تجسس پلٹا تو ایک مشکوک سی جانی پہچانی شخصیت پر نظر پڑی، چونکہ وہ روڈ کی دوسری طرف تھے اور میری اتنی دور کی نظر قحطِ عمری کے باعث زوال کا شکار تھی اس لئے مکمل پہچان قریب آ کر ہی ممکن تھی جس کے لئے موصوف نے کسی دعوت نامے کا انتظار نہیں کیا اور قلانچیں بھرتے ہوئے اور ٹریفک کی پرواہ کئے بنا میری جانب دوڑ پڑے اور جیسے جیسے ہمارا فاصلہ کم ہوتا گیا، ماضی کے جھروکوں سے دھندلاہٹ کم ہوتی گئی۔ ساتھ ہی میری کوفت میں اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ موصوف میرے اسکول کے زمانے کی کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے۔ کرکٹ یا کپتانی سے تو نابلد تھے ہی ساتھ ہی اخلاقیات اور رکھ رکھاؤ سے بھی ''ذاتی دشمنی'' رکھتے تھے لیکن یہ سوچ کر کہ اتنے سالوں میں دم کچھ نہ کچھ تو سیدھی ہوتی ہوگی۔ میں نے بھی ان کا استقبال کرنے کا ارادہ کرلیا جب ہمارے درمیان بہت کم دوری رہ گئی تو میں نے اندازہ لگایا کہ موصوف انتہائی کمزور ہو چکے ہیں جبکہ میں اب کافی حد تک فربہی کی جانب گامزن تھا، لہٰذا میں نے سلامتی بھیجنے سے پہلے تعزیت کرنا بہتر سمجھا۔ ابھی مناسب الفاظ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ موصوف سر پر آ دھمکے اور آتے ہی مجھ سے یوں بغلگیر ہوئے جیسے پنجابی فلموں میں الھڑ مٹیار شہری بابو سے لپٹ جاتی ہے۔ ساتھ ہی موصوف نے فلمی منظر کی تکمیل کے لئے پانچ چھ مرتبہ میرا نام زور زور سے اس طرح ادا کیا کہ آس پاس چلتے لوگوں کی آنکھیں نم ہوگئیں اور اس

سے پہلے کہ میں اُنھیں دلاسہ دیتا، کپتان صاحب نے مجھے اپنا کارڈ تھمایا اور اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ابھی میں ان تابڑتوڑ حملوں سے سنبھلا بھی نہ تھا، کہ کپتان صاحب ایک جانب چلاتے ہوئے دوڑے کہ میری بس آ گئی ہے، آنا ضرور۔۔۔اور میں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑا انہیں تکتا رہا۔

اپنے گھر واپس آنے کے بعد میں نے کارڈ کا بغور جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کپتان صاحب کسی بیمہ کمپنی میں ایجنٹ کے فرائض انجام دیتے ہیں لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ کارڈ پر ان کے گھر کے حوالے سے کوئی معلومات درج نہیں تھی، ظاہر ہے ایسے میں دعوت کا آغاز سے پہلے ہی انجام نظر آنے لگا، الہٰذا کم از کم اس وقت اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر منہ ہاتھ دھونے اور کھانے کی جانب توجہ کرنے میں ہی عافیت جانی۔

تمام کاموں سے فارغ ہو کر جب رات کو سونے کے لئے لیٹا تو اسکول کا زمانہ یاد آ گیا۔ ظاہر ہے سب کی طرح میرے اسکول کے دن بھی بہت یادگار تھے۔ پہلی سے آٹھویں جماعت تک مسلسل پوزیشنز لینے پر شاید میرے گھر والوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے، اِسی لئے نویں جماعت میں میرا داخلہ نسبتاً مہنگے اور ''معیاری'' اسکول میں کروایا گیا یہ گویا اعلان تھا ''اب لے پوزیشن۔''

چونکہ احتجاج کا حق نہیں تھا اس لئے مقابلہ ہی بہتر تھا، سو مزید محنت کی کوشش کی اسی اسکول میں ایک کرکٹ ٹیم بھی تھی جو کہ قابلیت، سامان، تعداد اور ظاہر ہے، نتائج گویا ہر میدان میں نامکمل تھی اسی لئے قابلیت درآمد کرنا سامان ادھار لینا تعداد پر صبر کرنا اور نتائج کے لئے دعا کرنا عام بات تھی۔ میں کرکٹ کا اوسط درجے سے بہتر کھلاڑی تھا الہٰذا مجھے بھی جلد ہی ''درآمد'' کر لیا گیا۔ اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق میں بھی جلد ہی راجہ کی کرسی پر جا بیٹھا گو نتائج بہت بہتر نہ ہوئے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ بہتری ضرور آئی۔ اس بات کی یہ توجیہہ دی جا سکتی ہے کہ کرکٹ ایک ''ٹیم گیم'' ہے اور یہی بات میں نے بھی رٹ لی تھی کیونکہ کم از کم میری کارکردگی بہتر تھی اسی ٹیم میں کپتان صاحب یعنی فیروز عالم صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی اور کارکردگی کی بنیاد پر میں کپتان صاحب کا لاڈلا بھی سمجھا جاتا تھا انہی سوچوں میں گم نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں ایک بار پھر خواب میں چھکے لگانے لگا۔

اگلے روز اپنے دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا دعوت قبول کرنی چاہئے یا نہیں، کافی سوچنے کے بعد نتیجہ صفر، اچانک اردو زبان کی قدیم مثال ''مال مفت دل بے رحم'' ذہن میں آئی، اور دونوں میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا اور آخر کار مال مفت نے دل بے رحم کو پچھاڑا اور میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھائے اور کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ نمبر ڈائل کیا۔

فون پہلی ہی گھنٹی پر اٹھا لیا گیا گویا دوسری جانب کوئی تیار ہی بیٹھا تھا ''فیروز صاحب سے بات۔۔۔'' ابھی میرے الفاظ میری زبان پر ہی تھے کہ دوسری جانب سے باقاعدہ خبرنامہ شروع ہوا ''ارے عارف! میرے دوست مجھے پتہ تھا تم ضرور فون کرو گے۔۔۔''

اور اس کے بعد موصوف نے اسکول کے زمانے سے آج تک کے تمام واقعات سنا ڈالے اور ہر واقعے کے عین درمیان شکوہ کہ رابطہ کیوں نہ رکھا۔ میں اس ڈیڑھ گھنٹے کی کال میں ''ہوں! ہاں!'' سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا، بہر حال دعوت کے لئے اتوار کا دن طے پایا ساتھ ہی موصوف نے اپنی زوجہ محترمہ کے بے انتہا غصے کا بار بار ذکر کر کے ایسا ماحول کھڑا کر دیا جیسے کہنا چاہتے ہوں ''ڈو دا ڈیؤ'' اور میں نے بھی یہ خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔

اتوار کے روز سفید کاٹن کا سوٹ اس نیت سے نکالا کہ ''سر بکف'' نہ سہی ''تن بکف'' ہی ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو جائے کہ اس جہان فانی سے کوچ کی نوبت آ جائے، کم از کم موزوں رنگ کے کپڑے تو تن پر ہوں گھر سے نکلنے سے پہلے جتنی قرآنی آیات یاد تھیں پورے خشوع و خضوع سے تلاوت کیں۔ بہن سے زبردستی امام ضامن بندھوایا اور دو رکعت نفل ادا کر کے دعائے مغفرت کی اور گھر سے اپنی موٹر سائیکل پر اپنا ممکنہ آخری سفر شروع کیا۔

فیروز صاحب کے گھر کے سامنے کھڑا ہونا بھی انتہائی فکر انگیز مرحلہ تھا۔ پہلی بار سمجھ آیا کہ لوگ فوج میں کیوں جاتے ہیں، وہی سرفروشی کی تمنا لئے پیش قدمی کا آغاز کیا ہی تھا کہ مخالف سرحدوں میں ہلچل ہوئی اور بنا دستک دروازہ کھل گیا اور فیروز صاحب اپنی پیچیدہ مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب پیش قدمی کرنے لگے، اس جگہ شہادت کے فضائل بھی سمجھ آئے۔ غرضیکہ موصوف گرمجوشی کے ساتھ اپنے گھر لے گئے بٹھایا پانی پیش کیا اور ساتھ ہی دونئی بیمہ اسکیموں کے کتابچے تھمادئے۔

مہمان نوازی میں یہ جدت پہلی بار دیکھی تھی، پھر بھی ذہن پر قابو پاتے ہوئے اہل وعیال کے متعلق دریافت کیا فیروز صاحب نے بتایا کہ بچے تو ابھی نہیں لیکن بیوی! اور خامشی بیوی کا لفظ ادا کرتے وقت ان کے لہجے میں خوف اور پچھتاوے کے ملے جلے اثرات دیکھ کر سمجھ آگیا کہ اب تک بچے کیوں نہ ہوئے!

ساتھ ہی فیروز صاحب نے محتاط رہنے کی سرکاری وارننگ بھی جاری کی کہ ''بیگم آج خفا ہیں۔''

ابھی وارننگ پوری طرح نشر ہوئی نہ تھی کہ کچن کی جانب سے دھڑام کی آواز سے ہم دونوں چونکے۔ میرے لئے تو ''چونکے'' کا لفظ کم پڑے گا اس لئے میرے لئے ''اچھلے'' کرلیں میرے اچھل کر واپس آنے سے پہلے ہی موصوف کچن کی جانب دوڑ چکے تھے جیسے ہی وہ کچن میں داخل ہوئے۔ گھر میں ایک ہولناک خاموشی نے ڈیرے ڈال دئے۔ اچانک ہی فیروز صاحب کی چیخ اور زوجہ محترمہ کا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوئے اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا علاقے کی بجلی بند کردی گئی گھر میں موجود واحد ایمرجنسی لائٹ اپنے آپ روشن ہو چکی تھی۔ ابھی میں اس اندھیرے اجالے میں گھر کی ہولناکی کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ کچن کی جانب کچھ کھٹ پٹ ہوئی اور ایک انسانی ہیولہ برآمد ہوا۔ بکھرے بال، ہاتھ میں بڑا سا اسٹیل کا چمچہ جس سے دھواں نکلتا ہوا، آہستہ آہستہ وہ ہیولہ جب میری جانب بڑھا میں صوفے کے اندر مزید دھنس گیا عین اسی وقت وہ ہیولہ ایمرجنسی لائٹ تک پہنچ چکا تھا۔

ہلکی روشنی میں چہرے کا پسینہ اس طرح چمکا کہ میری حالت مزید خراب ہوگئی۔ میں نے خود کو پاس رکھی میز کے قریب کیا کہ حفظ ماتقدم کے طور پر میز کا ہی سہارا لے لیا جائے لیکن بھابی میری جانب آئے بنا باہری دروازے کی جانب چلی گئیں چند لمحوں میں گھر کی روشنیاں لوٹ آئیں۔

ساتھ ہی فیروز صاحب کی آواز گونجی ''ماردیا۔۔۔''

میرے کپڑے مکمل پسینے میں بھیگ چکے تھے اور میں واضح طور پر دبکا بیٹھا تھا کہ بھابی میرے عقب سے کمرے میں داخل ہوئیں اور آتے ہی انتہائی نفیس انداز سے پوچھا ''بھائی صاحب کیسے ہیں آپ؟ دراصل کچن میں ایک کاکروچ نکل آیا تھا وہ اسے مارنے میں لگے ہیں!''

یہ سن کر میری جان میں جان آئی کہ پچھلے دس منٹ میں جو بھی شور شرابہ ہوا اس سے اگر کسی کی جان کو خطرہ تھا تو وہ بیچارہ کاکروچ تھا۔ اسی لمحے فیروز صاحب بھی کاکروچ کا جنازہ ہاتھ میں اٹھائے برآمد ہوئے اور اس کی آخری رسومات یعنی گٹر برد کرنے کے بعد باقاعدہ نہانے تشریف لے گئے۔

ان کے نہانے تک کھانا بھی مکمل کرلیا گیا اور ان کے آتے ہی میز بھی سجادی گئی کھانے سے فارغ ہونے تک میں گزشتہ پیش آئے واقعات کی روشنی میں یہ تہیہ کرچکا تھا کہ جو غلطی کاکروچ نے کی میں اسے نہیں دہراؤں گا اور اسی لئے میں نے گھر جانے سے پہلے دونوں بیمہ پالیسیز پر دستخط ثبت کردئے اور خوشی خوشی گھر کی جانب لوٹ گیا۔

ذیشان فیصل شان کراچی میں مقیم ہیں اور ایک ہمہ جہت اور اختراعی کمپنی سے وابستہ ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں، عموماً تازہ ملکی امور کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ طرزِ بیاں خاصا شوخ وشنگ ہے۔ برجستگی اُن کے کلام کا خاصا ہے۔ نثر بھی بہت اچھی اور جامع لکھتے ہیں۔ نثری اسلوب میں بھی طنز ومزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے یہ ان کی پہلی نثری کاوش ہے۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ